سُسرال

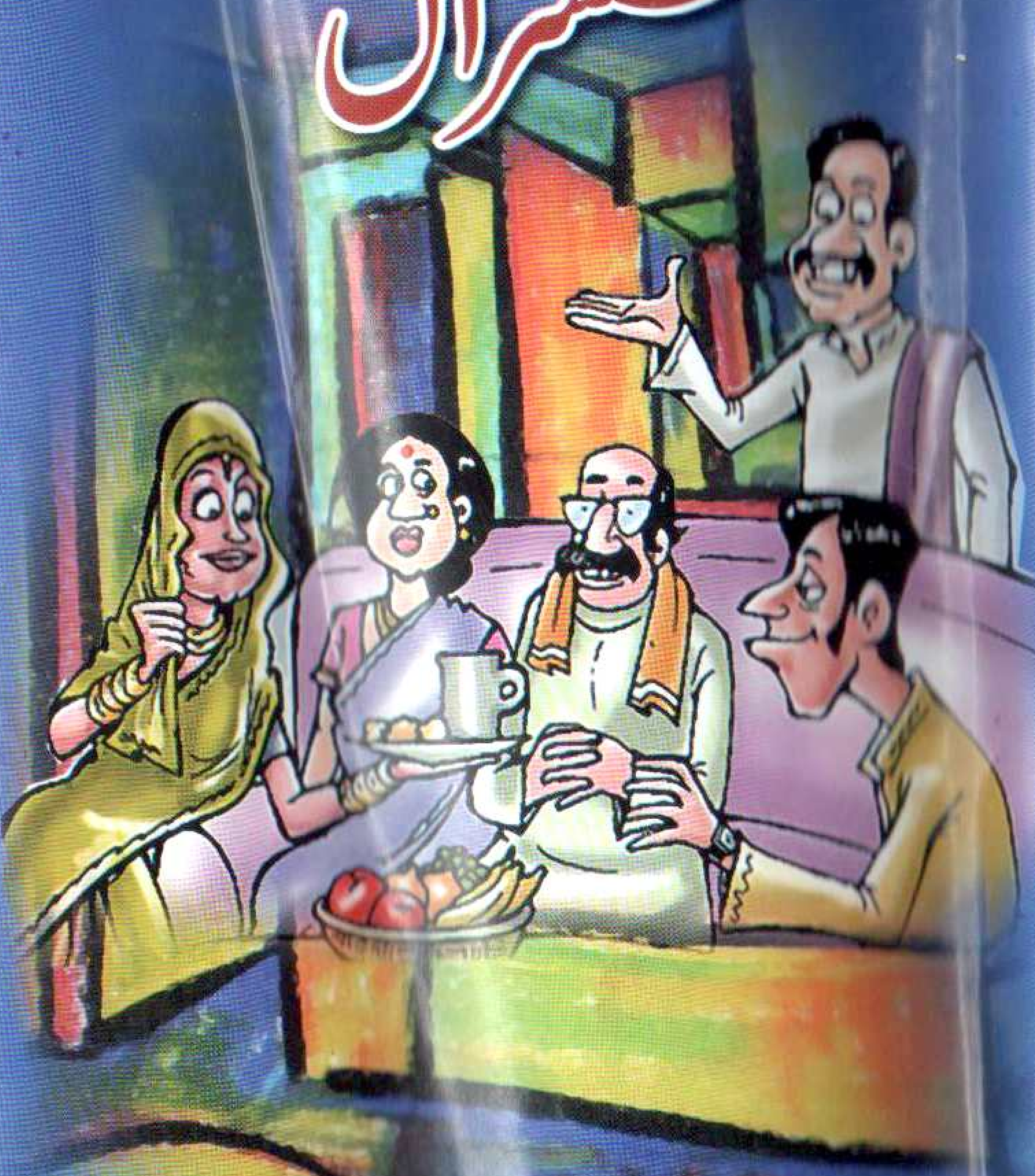

شوکت تھانوی

سُسرال

(ترمیم و اضافہ کے ساتھ)

شوکت تھانوی

ویلکم بُک پورٹ

جملہ حقوق بحق پبلشر "ویلکم بک پورٹ" محفوظ ہیں

اس کتاب کے کسی بھی حصے کی فوٹو کاپی، الیکٹرک یا کسی بھی قسم کی اشاعت پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔

قانونی مشیر: وحید نور

اشاعت	:	مارچ 2015ء
تحریر	:	شوکت تھانوی
زیر اہتمام	:	قمر زیدی
پبلشر	:	ویلکم بک پورٹ
پرنٹر	:	اے بی سی پرنٹرز، کراچی
قیمت	:	-/400 روپے

ویلکم بک پورٹ

مین اردو بازار کراچی۔ پاکستان

فون 021-32639581-32633151

فیکس : 021-32638086

ای میل welbooks@hotmail.com

wbp@welbooks.com

ویب : www.welbooks.com

فیس بک : Welcomebookport

ٹوئٹر : Welcomebookport

اُن پاکستانیوں کے نام

جن کی

بیویاں اور سُسرالیں ہندوستان میں ہیں

’’بھئی اب جو تم نے مکان کا نام لیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ بخدا سخت دل شکنی ہوتی ہے‘‘...... اور ہم نے دیکھا کہ واقعی ملک صاحب کی دل شکنی ہو رہی تھی اس لئے کہ وہ اس وقت حقہ پی نہیں رہے تھے بلکہ اس کو کھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ملک صاحب کو جب کبھی غصہ آتا تھا یا صدمہ ہوتا تھا یا وہ کیفیت ان پر گزرتی تھی جس کو وہ دل شکنی کہتے ہیں اس وقت شامت اکثر حقہ کی آیا کرتی تھی جس کی نے منہ میں دبا کر کچھ اس قسم کے تابڑ توڑ کش وہ لگاتے تھے کہ سارے کمرے میں دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا گویا ابھی ہیروشیما پر ایٹم بم گرا ہے خیر اس وقت تو ان کا غصہ یا وہ کیفیت جس کو وہ دل شکنی کہتے ہیں جائز بھی تھی کہ ان کا وہ مکان جس کا ایک سجا ہوا کمرہ ہمارے قبضہ میں تھا موجود ہے اور ہم مرے جارہے ہیں کسی اور مکان کے الاٹمنٹ کے لئے اس کمرے میں کیا کچھ نہ تھا ایرانی قالین کا فرش، دروازوں اور دریچوں پر خوب صورت ریشمی پردے، الماریوں میں چنی ہوئی کتابیں، ایک کونے میں آراستہ لکھنے کی میز چاروں طرف قیمتی صوفے، ایک طرف گدگدے بستر والی لچکدار مسہری، سرہانے ایک چھوٹی سی میز پر رکھا ہوا ریڈیو سیٹ، ایک میز پر ٹیبل لیمپ، اسی کمرے میں ملا ہوا چھوٹا سا خوب صورت تبدیلی لباس کا کمرہ جس میں ایک چھوڑ دو کپڑے ٹانگنے کی الماریاں اور اس چھوٹے سے کمرے سے ملا ہوا غسل خانہ یہ تو ہوا وہ سیٹ جو ہمارے لئے مخصوص تھا پھر مفت کے نوکر خاطر مدارات ایسی کہ اس پر تیمارداری کا اور اپنے اوپر مریض ہونے کا شبہ ہونے لگے۔ بستر کی چائے سے لے کر رات کے کھانے کے بعد کے خلال تک

چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر بات کی تاک خود ملک صاحب کو رہا کرتی تھی۔ اگر صبح حجام کو آنے میں دیر ہو جائے تو ملک صاحب بے قرار نظر آتے تھے کہ کس طرح وہ ہم کو راضی کر لیں کہ آج یہ خدمت ان ہی سے لے لی جائے۔ اور صرف ملک صاحب ہی نہیں اس گھر کا بچہ بچہ ایسا متواضع اور اس قدر نیاز مند نظر آتا تھا کہ اب کیا عرض کیا جائے۔ دفتر جانے کو تیار ہوئے تو سگریٹ کیس میں سگریٹ بھرے ہوئے موجود ہیں اور اس پر بھی ملک صاحب کو اطمینان نہیں ہے۔ بیٹھے خضاب لگا رہے ہیں مگر چیختے جاتے ہیں۔ ''ارے میاں ماچس بھی لے لی ہے..... وہ میں نے کہا وہ چار سگار بھی ڈال لو جیب میں۔ اے امامی سگار کا بکس لا کر دے دے نا.....'' دفتر سے واپس آئے تو میز پر ناشتہ چنا ہوا ہے اور ملک صاحب ہیں کہ انتظار میں ٹہل رہے ہیں۔ چونکہ ان کو معلوم ہے کہ دفتر سے آتے ہی غسل کرتے ہیں لہٰذا صورت دیکھتے ہی نعرہ بلند کریں گے۔ ''اے امامی دیکھ غسل تیار ہے۔'' اور پھر خود لپک کر غسل خانے میں گھس جائیں گے۔ لاکھ روکئے لاکھ منع کیجئے مگر کیا مجال کہ وہ خود جا کر اطمینان نہ کر لیں۔ اب ادھر ہم غسل خانے سے نکلے ادھر تازہ دم کی ہوئی چائے ٹی کوزی میں ملفوف آ گئی اور اندر سے گرما گرم پکوان کبھی پکوڑے، کبھی سموسے، کبھی نمک پارے چلے آ رہے ہیں اور ملک صاحب اس طرح اصرار کر کے زیادہ سے زیادہ ٹھنسا دینا چاہتے ہیں جیسے ممتا کی ماری کوئی ماں اپنے لعل کو بدہضمی میں مبتلا کر دینے کے درپے ہو۔ ''میاں کھاؤ نا یہی اس وقت کا کھایا پیا کام آئے گا اب میری عمر دیکھو اور یہ کلا ٹھلا دیکھو وجہ کیا؟ کہ جو ہم کھا پی چکے ہیں وہ اب دیکھنے کو بھی نہیں ملتا اور تم سارا دن دماغ کا عرق نکالتے ہو، انگریزی لکھتے ہو سارے دن دفتر میں بیٹھ کر، خوراک کا خیال نہ رکھو گے تو کرو گے کیا، لو یہ سیب کھاؤ کشمیر کا ہے، وہ میں نے کہا یہ کشمیر کا بنے گا کیا۔ بھئی کشمیر تو اگر سچ پوچھو تو ہمارا ہی ہے یوں دھاندلی کی بات ہی دوسری ہے۔'' ملک صاحب گفتگو میں اسی طرح کہیں سے

کہیں جا پہنچتے ہیں اب وہ سیب کھلائیں گے اور کشمیر کی سیاست میں الجھا کر یہ بھی بھلا دیں گے کہ چائے کی پیالی میں چینی پڑ چکی ہے یا نہیں۔ اور جب پتہ چلے گا کہ ڈیڑھ کے بجائے وہ روانی میں علی الحساب چار پانچ چمچے چینی کے ڈال کر چائے کو پشن کا مربہ بنا چکے ہیں تو صرف ایک "لاحول ولا قوۃ" دوسری پیالی نکالنے کے لئے کافی ہے اور اگر اسی وقت اندر سے گرما گرم پکوڑے آ گئے تو تمام بین الاقوامی موضوع ختم اور وہ ایک قہقہہ بلند فرما کر پکوڑوں کو اپنا موضوع سخن بنا لیں گے۔ "لیجئے جناب آج ہماری غزل نے پکوڑوں کا مضمون باندھا ہے۔" یہ غزل ان کی صاحبزادی ہیں، نام ہے بیچاری کا غزالہ مگر والد صاحب کبھی کبھی دلار میں ان کو غزل بھی کہا کرتے ہیں اب پہلا پکوڑہ خود نوش فرمائیں گے اور پھر آنکھیں بند کر کے جھومیں گے۔" بھئی واہ مزہ آ گیا۔ پکوڑا تو اس فن کار کا شاہکار ہے۔ میں نے ایسے پکوڑے یہ عمر ہونے کو آئی کبھی نہیں کھائے۔ جو خستگی، جو آب و نمک بلکہ مرچ بھی ان پکوڑوں میں ہوتی ہے کسی کو کہاں نصیب، اور میاں بڑے نصیبہ در ہو کہ تمہارے لئے غزالہ بی بی یہ زحمت برداشت کرتی ہیں ورنہ ان پکوڑوں کے لئے خوشامدیں کیجئے۔ عرضیوں پر عرضیاں دیجئے مگر ترساتی رہیں گی وہ تو کہو تمہارے طفیل میں ہم کو بھی مل جاتے ہیں۔ میاں کھا کر تو دیکھو یہ کوئی معمولی پکوڑے نہیں ہیں ذرا ان کی خستگی دیکھو۔ چٹپٹا پن دیکھو۔ لطافت دیکھو، اور پھر ہلکے کتنے ہیں معلوم ہوتا ہے پھول چن دیئے ہیں گلچیں نے۔"

اب اگر ان پکوڑوں کی تعریف نہ کی جائے تو کہیں ملک صاحب حقہ نہ کھانے لگیں اور تعریف کی جائے تو یہ خیال ضرور رکھا جائے کہ تعریف کافی ہو اور ذرا طویل ورنہ اسی بات کا اندیشہ ہے جس کو وہ دل شکنی کہتے ہیں اور چونکہ سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ ان پکوڑوں کو زیادہ سے زیادہ کھایا جائے لہٰذا جی چاہے یا نہ چاہے مگر ٹھونسے جاؤ ورنہ انیسؔ کہہ ہی گئے ہیں کہ آبگینوں کو ٹھیس بھی لگ جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ چائے ہو یا کھانا ملک صاحب کی موجودگی برحق ہے اور چونکہ خود ماشاءاللہ خوش خوراک ہیں لہٰذا ہمارے لئے بھی یہی چاہتے ہیں کہ کرایہ کا پیٹ سمجھ کر بس ٹھونستے ہی چلے جائیں ذرا بھی ہاتھ روکا اور ان کی آنکھیں گول ہوئیں۔ ''میاں یہ کیا واہیات ہے کھاتے ہو یا سونگھتے ہو۔ عزیزمن اتنا کم کھانا اس جوانی میں گھن لگا دے گا ابھی تم کو پہاڑ سی زندگی تیر کرنا ہے دنیا کا مقابلہ کرنا ہے۔ یہ خوراک رکھو گے تو خاک مقابلہ کرو گے۔

اب مجھ ہی کو دیکھ لو اب کے رمضان میں پورے ساٹھ کا ہو جاؤں گا مگر صبح اٹھ کر ڈھائی سیر دودھ تو ایک سانس میں پی جاتا ہوں...... '' اور واقعی وہ پی جاتے ہوں گے۔ بڑی آدم خوروں کی سی صورت پائی ہے۔ اس عمر میں دسترخوان پر وہ جھاڑ دیتے ہیں کہ بس دیکھتے ہی رہیئے اور دسترخوان ہی پر کیا منحصر ہے کہ کھانے کے مقررہ اوقات کے علاوہ یوں بھی کافی شغل فرماتے رہتے ہیں۔ ایک روز دفتر سے آ کر جو دیکھتے ہیں تو ملک صاحب کے اردگرد گنے کے چھلکوں کا عظیم الشان ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اور وہ ایک موٹے سے گنے کو بیٹھے بھنبھوڑ رہے ہیں ہنس کر فرمایا۔ ''آؤ ذرا دانتوں کی ورزش ہو جائے گاؤں سے گنے آ گئے ہیں۔'' معلوم ہوا کہ یہ سولہواں گنا زیر بحث ہے۔ ایک دن اسی طرح آم کھاتے آپ کو دیکھا تھا اور ڈر لگا تھا کہ اگر آم ختم ہو گئے اور نیت یا پیٹ دونوں میں سے کوئی نہ بھرا تو شاید ہم ہی کو نوش فرما جائیں۔ مطلب کہنے کا یہ کہ کھانا تو خیر کھاتے ہی ہیں مگر یہ نہیں کہ بس کھانے ہی کے ہو کر رہ جائیں معدے کو طرح طرح سے آزماتے ہیں اور معدہ بھی عجیب ڈنلپ کے کارخانے کا بنا ہوا پایا ہے کہ حسب ضرورت بڑھتا رہتا ہے۔

ملک صاحب کو سوائے کھانے اور پھر کھانا ہضم کرنے کے اور کام ہی کیا ہے۔ گھر کے رئیس ٹھہرے۔ گاؤں گراؤں، کوٹھیاں، حویلیاں، سواری کے لئے موٹر خدا کا دیا سب کچھ ہی ہے سوائے عقل کے اور اگر غور کیجئے تو اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ نہ ان کو تجارت کرنا

ہے کہ عقل کو کام میں لائیں نہ ملازمت کی ان کو ضرورت، ایسی صورت میں اگر عقل ہوتی بھی تو پڑے پڑے زنگ کھایا کرتی اولاد کے معاملہ میں بھی ایک حد تک خوش نصیب ہیں کہ بس ایک لڑکی ہے جو ابھی نا کتخدا ہے اور بقول ملک صاحب کے خداوند کریم اپنے کسی بندے سے جب بہت زیادہ خوش ہوتا ہے تو اس کو اپنے خزانہ غیب سے ایک ایسی لڑکی عطا کر دیتا ہے جیسی ان کی غزالہ ہے۔ البتہ ملک صاحب کی روح اگر کسی سے فنا ہوتی ہے تو وہ ہیں آپ کی بیگم صاحبہ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ملک صاحب کی بیوی ایسی نہ ہوتیں جیسی ہیں تو ملک صاحب کا خدا ہی حافظ تھا۔ بیوی کیا ہیں اچھی خاصی کوتوال شہر ہیں ملک صاحب کے حق میں۔ صبح کے وقت ایک سانس میں ڈھائی سیر دودھ پی جانے والا یہ آدم خوروں کی سی صورت کا ابوالہول بڈھا بیوی کی ایک ڈانٹ پر ایسا بھیگی بلی بن کر رہ جاتا ہے کہ خدا کی شان نظر آتی ہے۔ ان کے ایک بہت پرانے نوکر نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ ملک صاحب خود دراصل نہایت ٹٹ پونجیئے پھٹیچر قسم کے آدمی تھے وہ تو کہیئے کہ بیگم صاحبہ کے والد نے ان کو گھر داماد بنا کر پال لیا یہ تمام دولت بیگم صاحبہ کی ہے اور ملک صاحب کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ بیگم صاحبہ کی ڈیوڑھی پر بحیثیت شوہر کے گویا ملازم ہیں۔ اور سب کے سامنے خواہ کتنا ہی کیوں نہ اکڑیں گر قلعی کھلتی ہے بیگم صاحبہ کی پیشی میں پہنچ کر۔ اس دل جلے نوکر نے یہ بھی بتایا کہ بڑے میاں بڑے چھپے رستم بھی ہیں اور بڑے رنگیلے بھی رہ چکے ہیں۔ اگر بیگم صاحبہ ایسی ہی زبر نہ ہوتیں تو یہ تو کب کا گھر پھونک تماشہ دیکھ چکے ہوتے۔ یہ عمر ہونے کو آئی مگر بیگم کو اب تک بڑے میاں کی طرف سے اطمینان نہیں ہے کہ نہ جانے کب یہ بڈھا سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہو جائے۔ نوکر کے اس بیان کی روشنی میں جو ملک صاحب کا جائزہ لیا تو واقعی وہ کچھ نظر تو ایسے ہی آئے۔

☆☆☆

صاحب ہمارا اور ملک صاحب کا قصہ شروع یوں ہوتا ہے کہ ہم ٹھہرے پردیسی بلکہ مہاجر اور آب و دانہ گھسیٹ کر لایا اس لاہور میں جہاں سب ہی کچھ مل سکتا ہے۔ البتہ اگر نہیں مل سکتا تو صرف مکان اور جب تک ایک بھلے آدمی کو مکان نہ ملے وہ کچھ عجیب اٹھائی گیرہ سا نظر آتا ہے۔ مکان حاصل کرنے کے لئے کون سے جتن تھے جو نہ کئے۔ الاٹمنٹ کے لئے درخواستیں دیں۔ مسلم مالکان مکان کے پاس سفارشیں پہنچوائیں اور خود ڈالیاں لگائیں ان کی درباروداری کی۔ محکمہ آبادکاری کے چپراسیوں تک سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی تمنائیں کیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ ذرا دیر آشنا اور زود فراموش نکلے اور تعلقات پیدا نہ ہو سکے اور آخر زندگی کا مقصد صرف یہ رہ گیا کہ ہوٹل میں صبح کی چائے پی کر نکلنا۔ شہر کے کسی نہ کسی محلہ میں گھس جانا اور ہر مکان کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا کہ کاش یہی خالی ہوتا۔ معیار گرتے گرتے کوٹھی سے فلیٹ تک آیا اور اب فلیٹ سے بھی گر کر تمنا صرف یہ تھی کہ بس ایک دروازہ نظر آ جائے اور اس میں بس دو کمرے ہوں ایک باورچی خانہ اور ایک غسل خانہ ہو تو ہم سمجھیں گے کہ ہم کو محل مل گیا۔ مگر محلے تو محلے کسی قبرستان کے آس پاس بھی کوئی ایسی جگہ نہ مل سکی جس کو ہم شاعرانہ مبالغے ہی کے ساتھ مکان کہہ سکیں۔ خدا بھلا کرے ایک تانگے والے کا جس نے ملک صاحب کا پتہ بتایا کہ ان کا ایک مکان خالی ہوا ہے۔ جی چاہا کہ اس تانگے والے کو گلے سے لگا کر اس کا منہ چوم لیں۔ مگر اس بات کو اسکی متانت کے خلاف پا کر ضبط سے کام لینا پڑا پھر بھی جذبات تو ابل ہی رہے تھے کہ ایک دم

زبان سے نکلا۔

''تمہارے منہ میں گھی شکر۔ کہاں ہے وہ مکان میاں تانگے والے۔''

تانگے والے نے اپنے گھوڑے سے بے تکلفی برتتے ہوئے غالباً اسی سے کہا۔

''اے تیتو......''

اور ہم سے کہا۔ ''مکان تو ذرا دور ہے پر ہے خالی۔''

ہم نے کہا۔ ''دور کی پروا نہیں بس لاہور میں ہونا چاہئے اور خالی ملنا چاہئے۔''

تانگے والے نے کہا۔ ''خالی تو ہے ہی بس ملک صاحب کی بھینس بندھتی ہے اس میں۔ مگر میاں جی آپ اکیلے ہی ہیں نا۔''

ہم نے کہا۔ ''یہ کیا بات ہوئی۔''

تانگے والے نے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ ملک صاحب بیوی بچوں والے کو مکان نہیں دیتے۔''

یہ وقت بیوی بچوں کو یاد کرنے کا نہ تھا لہٰذا ہم نے کہا۔ ''بھائی میں بالکل اکیلا ہوں۔ مگر مکان کیسا ہے۔''

''تانگے والے نے کہا۔'' بس مکان ہے۔ ایک کمرہ تو خیر بیکار سا ہے چھت گر گئی تھی اس کی۔ دوسرا کمرہ ٹھیک ہے اسی میں آج کل بھینس بندھتی ہے۔ البتہ پانی نہیں ہے تو کیا ہوا نہ سہی پانی بہشتی لگا لیجئے گا یا سڑک ہی پر نل ہے بھر لیا ایک گھڑا اکیلے تو آپ آدمی ہیں۔''

ہم نے کہا۔ ''اور باورچی خانہ غسل خانہ وغیرہ۔''

تانگے والے نے حیرت سے ہمارا منہ دیکھ کر کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے مکان آپ کو نہیں چاہئے۔''

ہم نے گڑبڑا کر جلدی سے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''لو سگریٹ پیو۔ مکان تو

مجھ کو بہرحال چاہئے مگر میں چاہتا تھا کہ اگر باورچی خانہ اور غسل خانہ بھی ہوتا تو اچھا ہی تھا۔ خیر نہیں ہے تو نہ سہی۔''

'' تانگے والے نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ چیزیں ہوتی ہیں سب بے فکری کی آپ کو سر چھپانے کی جگہ مل جائے تو بہت ہے، ویسے میں نے اس میں باورچی خانہ بنالیا تھا ایک طرف۔''

ہم نے چونک کر کہا۔ ''اچھا تم نے، تو گویا تم رہ چکے ہو اس میں تو چھوڑا کیوں تم نے۔''

تانگے والے نے کہا۔ ''پانی اگر برس جائے تو ٹپکتا بہت ہے مگر خیر پانی تو کبھی کبھار برستا ہے البتہ دوسرے گھروں کا پانی اس میں بہت آتا ہے اور جب آتا ہے تو پھر باہر نہیں نکلتا۔ تنگ آ گیا تھا میں پانی نکالتے نکالتے اور اسی پانی کی وجہ سے مچھر بہت پیدا ہوتا ہے۔''

ہم نے گھبرا کر کہا۔ ''بھئی یہ تم نے بہت بری سنائی اس کا مطلب تو یہ ہے کہ پھر بیکار ہی ہوا وہ مکان۔''

تانگے والے نے گھوڑا موڑنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر جانے دیجئے۔ میں تو خود ہی جانتا تھا کہ آپ کو مکان کی اصل میں ضرورت نہیں ہے۔''

ہم نے بدحواسی سے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ ''نہ۔ نہ۔ نہ۔ تم سمجھے نہیں میرا مطلب۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اس مکان کو تو خیر لے ہی لینا چاہئے۔ اس لئے کہ مل رہا ہے مگر اس میں رہ کر کوئی اچھا مکان ضرور تلاش کرنا چاہئے۔''

تانگے والے نے خوش ہو کر گھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اب کہی ہے آپ نے ایک بات یہی میں نے بھی کیا تھا اس مکان میں رہتا تھا اور دوسرا مکان ڈھونڈتا تھا جب مل گیا تو مکان، تو میں نے لعنت بھیجی اس پر۔ ایک بات کا خیال رکھئے گا کہ بابو جی کہ روپیہ

پیسہ اس مکان میں زیادہ نہ رکھئے گا۔ چوری کا ڈر ہے۔"

ہم نے کہا۔ چوری کا ڈر۔ میاں ایسے بیہودہ مکان میں چور آ سکتے ہیں۔"

سگریٹ کا ایک کش لے کر اطمینان سے بولا۔ "بات یہ ہے کہ اس مکان میں ذرا دروازے نہیں ہیں یونہی کھلا پڑا رہتا ہے مکان، ایک مرتبہ تو کوئی اللہ کا بندہ میری چارپائی اور بستر تک لے اڑا دن دہاڑے۔"

ہم نے گھبرا کر کہا۔ "بھائی روپیہ پیسہ نہ سہی مگر کپڑے لتے، کتابیں اور ضرورت کی ایک آدھ چیز تو رکھنا ہی پڑے گی۔ خیر میں دیکھ تو لوں اس مکان کو شاید دروازہ لگ سکتا ہو۔"

تانگے والے نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا اور وہ برابر اپنے گھوڑے کی شان میں گستاخیاں کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ آبادی بالکل ختم ہوگئی اور ہرے بھرے کھیت نظر آنے لگے۔ دل باغ باغ ہوگیا۔ ان کھلی ہوئی فضاؤں کو دیکھ کر چلئے اور کچھ نہ سہی صحت کے اعتبار سے تو یہ مکان اچھا ہی رہے گا۔ شہر اور اس کے ہنگاموں سے دور۔ سورج نکلتا ہوا دیکھیں گے۔ ہرے بھرے کھیتوں میں شبنم کے موتی علی الصبح لوٹا کریں گے۔ شام کی سرمگیں فضائیں ان کھیتوں میں کس قدر رومان انگیز معلوم ہوں گی۔ لیجئے چلتے چلتے کھیت بھی ختم ہوگئے اور اب سڑک کے دونوں طرف سپاٹ میدان تھا۔ غالباً اسی میدان سے شہر بھر کے لئے گرد و غبار سپلائی ہوتا تھا۔ حد نظر تک میدان کو دیکھ کر غالباً کچھ وحشت سی ہوئی ایسا ویرانہ دیکھ کر وحشتیں عود کر ہی آتی ہیں۔ ہم نے پہلے تو انتظار کیا کہ شاید یہ ویرانہ ختم ہو جائے اور آبادی کے کچھ آثار پیدا ہوں مگر جب اس طرف سے مایوس ہی ہوگئے تو تانگے والے سے عرض کیا۔ "اندازاً کتنی دور ہوگا وہ گھر۔"

تانگے والے نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "بس اس میدان کے ختم ہوتے ہی ایک

نالہ ہے۔ وہاں سے آبادی نظر آنے لگے گی۔"

گویا مقدر میں ایک نالہ بھی لکھا ہوا تھا جس کی ہم کو اطلاع ہی نہ تھی۔ بہرحال اب نالہ ہو یا کچھ مکان تو حاصل ہی کرنا تھا۔ اس ویرانے سے خیالات کو ہٹانے کے لئے اساتذہ کا کچھ کلام گنگنانا شروع کیا مگر فوراً ہی اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا کہ اگر گھوڑا کچھ تھوڑا سا لنگڑا۔ تانگہ کچھ تھوڑا سا بوسیدہ اور راستہ کچھ تھوڑا سا ناہموار ہو تو مسافر کو غزل ہرگز نہ گنگنانا چاہئے اس موقع کے لئے خداوند کریم نے بلینک ورس کی تخلیق فرمائی ہے۔ سچ ہے اس کی کوئی تخلیق مصلحت سے خالی نہیں۔ غالب کی غزل ملاحظہ ہو اور اس کے یہ بلینک ورسانہ ٹکڑے کہ۔

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو
تو کیونکر ہو
کہو گے کچھ نہ ہوا پھر کہو
تو کیونکر ہو
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال کہ گر نہ ہو
تو کہاں جائیں
ہو تو
کیونکر ہو

اسی ویرانہ میں غالب کا تصور ابھر کر سامنے آ گیا کہ بندہ نواز رحم فرمائیے اور ہم نے ذہن پر زور ڈال کر موقع اور محل کی مناسبت سے۔ یہ نظم گنگنانا شروع کیا۔

میرے افکار کی نوجوان زندگی غیر فانی نہیں یہ سمجھتا ہوں میں
"میں تو بس حسن کی مورتی کے لئے اس کے قدموں پر تازہ ترین پھول ہوں۔"
"دو گھڑی کے لئے شاد ہو لیجئے دو دھوپ بڑھتے ہی میں ختم ہو جاؤں گا۔"

یہ سمجھتے ہوئے اے سہانی ہوا
اے معطر فضا
اے حسین تتلیو
میرے گیتوں کی من بھاؤنی کونلو!

اور خدا کی شان یا بلینک ورس کا اعجاز کہ یہ وہی ان غیر مرتب نشیب و فراز کے بالکل حسب حال تھی جہاں سڑک ہموار آ گئی پورا مصرعہ پڑھ گئے کھانچہ آ گیا تو ''اے معطر فضا'' کھانچے سے نکلے تو ''اے حسین تتلیو'' پھر چلے تو ''میرے گیتوں کی من بھاؤنی کونلو'' اور یہ نظم اس اعتبار سے بھی بھاگوان ثابت ہوئی کہ تانگے والے نے گھوڑے کو چمکارتے ہوئے ہم سے کہا۔ ''لیجئے بابو جی یہ ہے مکان۔''

اور ہم نے دیکھا کہ وہ ایک ٹاپو کو مکان کہہ رہا تھا جس کے اردگرد پچھلے ماہ برسے ہوئے پانی کی نہایت کہنہ مشق جھیل سی تھی۔ ہم ابھی اس بات پر غور کر رہے تھے کہ تیرنا ہم جانتے نہیں اور یوں بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا ہے کہ تانگے والے نے کہا۔ ''پہلے چل کر ملک صاحب سے مل لیجئے۔ مگر پھر یاد کر لیجئے۔ بیوی بچے تو نہیں ہیں۔'' ہم نے بیوی بچوں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں بھائی بالکل نہیں۔''

تانگے والے نے کہا۔ ''تو پھر آیئے میرے ساتھ۔''

اور وہ ہم کو لئے ہوئے اس ٹاپو سے دور ایک خوب صورت کوٹھی کی طرف بڑھا۔ یہ کوٹھی یا تو واقعی بہت شاندار تھی یا اس ویرانے میں خواہ مخواہ اتنی شاندار نظر آ رہی تھی۔ کوٹھی کے خوب صورت باغ میں داخل ہوتے ہوئے تانگے والے نے کہا۔ ''کوٹھی کیا ہے جنگل میں منگل ہے۔ اپنا پانی اپنی بجلی گھر کے پھل۔ گھر کی ترکاریاں اور تالے پر اپنا پل۔''

ہم نے کہا۔ ''اپنے پل سے کیا مطلب۔''

تانگے والے نے کہا۔ ''اس پل پر سے بس ملک صاحب کی موٹریں آ جا سکتی ہیں۔ ہم لوگوں کو اجازت نہیں ہے۔ ہم تو بس اسی راستہ سے آ سکتے ہیں جس سے آئے ہیں۔ وہ دیکھئے ملک صاحب باغ میں ٹہل رہے ہیں ان سے ذرا سمجھ بوجھ کر بات کیجئے گا۔''

اور ہم نے دیکھا کہ ان حضرت کو ہم کہیں دیکھ چکے ہیں۔ دماغ پر کافی زور ڈالنے کے بعد یاد آیا کہ بہت دن ہوئے جب کہیں دیکھا ہے غالباً اسکول کے زمانہ میں اور فوراً یاد آ گیا کہ ان کو نہیں دیکھا ہے تاریخ ہند میں لارڈ رپن کی تصویر دیکھی تھی۔ وہ اپنی مشابہت پا کر ذہن میں اس وقت ابھر آئی ہے۔ اب ہم ملک صاحب کے بالکل سامنے پہنچ گئے تھے۔

ملک صاحب کو سلام تو ہم نے کیا مگر ملک صاحب متوجہ ہوئے تانگے والے سے۔

''کہاں رہے تاج دین اتنے دن۔ بہت دنوں بعد صورت دکھائی۔''

معلوم ہوا تانگے والے کا اسم گرامی تاج دین ہے۔ وہ کھیسیں نکال کر بولے۔ ''گھوڑا بیمار تھا اس لئے نہیں آیا۔ آج ان بابو جی کو لے کر آیا ہوں ان کو مکان کی ضرورت ہے۔''

ملک صاحب نے ہم کو سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مکان؟'' گویا ہم مکان تھے اور وہ ہمارا نقشہ دیکھ رہے تھے۔ ''مگر بھائی مکان یہاں کہاں دھرا ہے۔''

تانگے والے نے کہا۔ ''وہی جس میں، میں رہتا تھا۔''

ملک صاحب نے کہا۔ ''ارے وہ لاحول ولا قوۃ۔ اس میں رہیں گے؟ اسم مبارک جناب کا؟''

ہم نے سچ سچ بتا دیا۔ ''شفقت کہتے ہیں اس خاکسار کو۔ بے حد شکر گزار ہوں گا اگر آپ سر ڈھانکنے کو کوئی جگہ دیدیں۔''

ملک صاحب نے ہمدردانہ انداز سے فرمایا۔ ''اور کام کیا کرتے ہیں آپ۔''

عرض کیا۔ ''ایک کالج میں پروفیسر ہوں۔''

ملک صاحب نے گویا خوش ہو کر فرمایا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا پڑھے لکھے آدمی ہیں صورت سے خاندانی اور مہذب بھی معلوم ہوتے ہیں وطن جناب کا؟''

عرض کیا۔ ''غریب خانہ دلی میں تھا۔''

ملک صاحب نے نہایت شرافت برتتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ کے ساتھ ہے کون کون۔''

''تانگے والے نے ہم کو گھورا خیر وہ نہ گھورتا تو بھی ہم کو یاد تھا کہ گویا ہم تنہا ہیں لہٰذا عرض کیا۔ ''ہوتا کون قبلہ تنہا ہوں۔ ہوٹل میں پڑا ہوں مگر ہوٹل کی زندگی قطعاً شریفانہ نہیں۔''

ملک صاحب نے تائید کی۔ ''ہرگز شریفانہ نہیں۔ بہرحال یہ خانہ بے تکلف ہے فی الحال آپ میرے ساتھ رہئے۔ وہ مکان میں ٹھیک کرادوں گا۔ تو اس میں چلے جائیے گا۔''

اور صرف یہی نہیں تانگے والے کو بھی خود ہی کرایہ دے کر رخصت کر دیا لاکھ کہا کہ سامان تو لے آؤں کہنے لگے کل آ جائے گا۔

☆☆☆

کہوں کہ کون سی بڑی بات کہہ رہے ہیں۔ تم منہ ہاتھ دھولو جب تک۔"

اور یہ کہہ کر کمرے سے ملے چھوٹے کمرے میں تقریباً دھکیلیں ہی رہا تا کہ غسل خانہ ہم کو خود نظر آ جائے اور خود ایک طرف چل دیئے۔ مجبوراً ہم نے کوٹ اتار کر ایک طرف ٹانگا اور ہاتھ منہ دھو کر تولئے سے ابھی منہ خشک ہی کر رہے تھے کہ باہر سے آواز آئی۔

"آ جاؤ بھائی اب ٹھنڈی ہو جائے گی چائے۔"

ہم جلدی سے کوٹ پہن کر برآمد جو ہوئے تو ملک صاحب گرم گرم چائے اپنی پیالی میں انڈیل رہے تھے ہم کو دیکھ کر بولے۔ "خون کبوتر ہو رہی ہے چائے بھی۔ تمہارے لئے بناؤں یا دست خود دہان خود کے قائل ہو۔"

عرض کیا۔ "جی نہیں میں خود بنائے لیتا ہوں۔ مگر کیا عرض کروں مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ واقعہ ہے یا خواب۔"

ملک صاحب نے بغیر مسکرائے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "خواب تو یہ خیر کیا ہوتا، ہے تو واقعہ ہی۔ مگر میں مسلسل ایک اور بات سوچ رہا ہوں کہ ضرورت مند اپنی غرض کا کس قدر دیوانہ ہوتا ہے کہ نہ نتائج پر غور کرتا ہے نہ پیش آنے والی مشکلات کا تصور کرتا ہے۔ اور نہ اس بات پر نظر ڈالتا ہے کہ ایک مشکل کا حل کتنی اور مشکلات کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ اب مثلاً مجھ کو یہ ہنسی آ رہی ہے کہ آپ یہاں کے ایک کالج میں پروفیسر ہیں۔ ظاہر ہے کہ روز کالج جانا ہوگا اور روز کالج سے واپس آنا ہوگا اور خدا کے فضل و کرم سے یہ مقام شہر سے چھ میل کے فاصلے پر ہے پھر یہ کہ یہاں آنے کے لئے نہ کوئی سواری مل سکتی ہے اور نہ مروجہ قسم کی سواریاں ان نشیب و فراز کو طے کر سکتی ہیں مگر چونکہ مکان کے لئے پریشان ہیں لہٰذا یہ کچھ نہیں سوچ رہے ہیں اور چونکہ یہ سن پایا ہے کہ یہاں ایک مکان مل سکتا ہے لہٰذا یہاں تک دوڑے چلے آئے۔"

عرض کیا۔ ''آپ درست فرماتے ہیں مگر میں اس پر غور کر چکا ہوں میں نے دیکھا ہے کہ یہاں سے ایک میل کے فاصلہ تک بس آتی جاتی ہے لہٰذا یہ مشکل میرے نزدیک حل ہو گئی ہے۔''

ملک صاحب نے کہا۔ ''خاک حل ہو گئی ہے۔ یہ لو کیک۔ میاں یہ گھر ہی کا ہے۔ یہاں جو کچھ تم کو ملے گا گھر ہی کا ہے۔ گھر کا پانی اس لئے کہ ٹیوب ویل اپنا ہے۔ موٹر لگا لیا ہے اور واٹر ورکس کا لطف آتا ہے۔ بجلی اپنی ہے اس لئے کہ یہاں تک سرکاری بجلی نہیں آتی۔ بہرحال تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس کو مشکل کا حل ہونا نہ سمجھو اول تو بس کے بھروسے پر بے بس ہونے کا میں قائل نہیں دوسرے ذرا سی بارش ہو جائے پھر بس تک پہنچنے کے لئے تم کو اسٹیمر کی بھی ضرورت ہوگی۔ اور میاں سب سے بڑی بات تو یہ کہ جس گھر کو تم گھر سمجھ کر آ گئے ہو وہ ایک سرے سے گھر ہی نہیں ہے۔ اصطبل تھا کسی زمانہ میں اور اب اس میں بھینس بندھتی ہے۔''

عرض کیا۔ ''یہ بات اگر آپ تانگے والے کی موجودگی میں فرما دیتے تو واپسی کی آسانی رہتی۔''

ملک صاحب نے حیرت سے فرمایا۔ ''واپسی کا سوال میرے کس جملہ سے پیدا ہوا۔ اب واپسی کا کیا سوال میں تو یہ کہہ رہا تھا یہ بس وغیرہ کا قصہ ہے واہیات۔ گھر کی کار ہے۔ ڈرائیور مفت کی روٹیاں توڑا کرتا ہے اب کم سے کم یہ تو کرے گا کہ پہنچا آیا تم کو اور لے آیا۔''

ہم نے حیرت سے ملک صاحب کا منہ دیکھا کہ تانگے والے کو واپس کر دیا ہے اور یہ سمجھ چکے ہیں کہ ضرورت مند پھنسا ہے لہٰذا اب یہ بھونڈا مذاق ہو رہا ہے۔ بھلا کوئی پوچھے کہ ہم آپ کے کون، ہم کو آپ نہ صرف اس پر تکلف سوٹ میں ٹھہرائیں گے بلکہ کالج جانے

اور آنے کے لئے کار تک مرحمت فرمائیں گے۔ مگر اس مذاق کا جواب ہی کیا دے سکتے تھے۔ بندھا ہوا مار کھاتا ہی ہے۔ لہٰذا کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گئے، ملک صاحب نے اس ہنسی پر سنجیدگی سے کہا۔

"ہنسی کی بات نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں بالکل حرام کی تنخواہ مل رہی ہے اس ڈرائیور کو۔ میں کہیں آتا جاتا نہیں، اپنی یہ چھوٹی سی دنیا بسائے الگ پڑا ہوا ہوں۔ رہ گئیں بیگم یا بچی وہ کبھی کبھار شہر ہو آئیں تو ہو آئیں ورنہ کار گویا بےکار پڑی رہتی ہے۔"

عرض کیا۔ "یہ تو درست ہے مگر میں حیران ہوں کہ آخر ان نوازشات کا مجھے کیونکر حق پہنچتا ہے۔"

ملک صاحب نے جو کچھ چبا رہے تھے اس کو نگلتے ہوئے کہا۔ میاں سب سے بڑا حق یہ کہ تم ہوٹل کی زندگی کو غیر شریفانہ سمجھتے ہو۔ اور ایک وہ نمک حرام ہے۔ بخدا صورت سے نفرت ہوگئی ہے اس کی سامنے آجاتا ہے تو خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ گولی ماردوں۔ صاحب ہم نے پالا۔ پوسا۔ دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ لکھانے پڑھانے کے لئے کون سے جتن نہیں کئے۔ اچھے سے اچھا کھلایا۔ اچھے سے اچھا پہنایا مگر اس ہوٹل بازی نے اس مردود کو دو کوڑی کا کردیا......"

عرض کیا۔ "یہ کس کا ذکر ہے......"

دانت پیس کر بولے۔ "ایک ناخلف کا ذکر کررہا ہوں۔ ناہنجار حرام خور۔ محسن کش۔ میاں قصہ دراصل یہ ہے کہ میری صرف ایک بچی ہے زندگی بھر کی کمائی اور خدا کا ہزار ہزار شکر و احسان کہ اس نے مجھ کو ایسی بچی عطا فرمائی ہے کہ میں اس کا شکر ادا نہیں کرسکتا۔ نہایت سعادت مند، سلیقہ شعار، کھانے پکانے میں طاق، سینے پرونے میں مشاق، یہ صوفوں کے کشن اسی نے بنائے ہیں اور یہ کیک اسی نے بنایا ہے۔ ذرا کھا کر دیکھو تو سہی۔"

عرض کیا۔ ''جی ہاں میں نے کھایا ہے واقعی نہایت نفیس ہے۔''

جوش میں بولے۔ ''ہے نا نفیس؟ تو صاحب ایسی تو وہ لڑکی پھر یہ کہ اندھے کی لاٹھی جس کی ایک اولاد ہو وہ کیونکر گوارا کر سکتا ہے کہ اس کو اپنے سے جدا کرے، چنانچہ اس خیال سے کہ لڑکی گھر ہی میں رہے اپنے ایک دور کے عزیز کا لڑکا میں نے اپنے پاس رکھ کر سب کچھ اس کم بخت کے لئے کیا۔ مگر صاحب اس نے جوان ہوتے ہی وہ پر پُرزے نکالے کہ میں کیا عرض کروں، اے جناب اس نے ہوٹل بازی شروع کر دی۔''

ہم نے واقعی تعجب سے پوچھا۔ ''یہ ہوٹل بازی آخر کیا ہوتی ہے۔''

کہنے لگے۔ ''کیا کہا؟ ہوٹل بازی؟...... ارے صاحب اسی نے تو اس لونڈے کا ناس مارا ہے۔ شروع شروع میں تو یہ ہوا کہ آج اس دوست کو لئے ہوٹل میں بیٹھے ہیں چائے پانی اڑا رہے ہیں کل اس دوست کے ساتھ ہوٹل میں جمے ہوئے ہیں۔ لاکھ سمجھایا کہ میاں شریفوں کے اطوار نہیں ہیں۔ ایسا ہی ہے تو دوستوں کو گھر لاؤ۔ مگر توبہ کیجئے گھر سے نکلا ہوٹل میں موجود۔ نتیجہ یہ کہ لگ گئی وہ حرام شے بھی منہ سے۔''

چونک کر عرض کیا۔ ''یعنی شراب۔''

کہنے لگے۔ ''اخ تھو جی ہاں وہی کم بخت اور اب دن رات پی رہے ہیں اور جو ہو رہا ہے۔ ڈرایا۔ دھمکایا مگر توبہ کیجئے اور تو اور ایک دن ہوٹل جا کر دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بازاری عورت بھی...... میاں اب کیا کہلواؤ گے مجھ سے اس لونڈے نے تو میری تمناؤں پر پانی پھیر دیا۔''

ہم نے کہا۔ ''اس میں ہوٹل سے زیادہ خود ان حضرت کی فطرت کا قصور تھا۔''

کہنے لگے۔ ''بات یہ ہے کہ ہوٹل اپنا ہی تھا اور میں جانتا ہوں کہ ہوٹل مسافروں سے زیادہ کن لوگوں کا اڈا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ میں نے اس کم بخت کی طرف سے صبر کر لیا۔ ہوٹل بھی بیچ دیا اور اب ہوٹل کے نام سے میرے ہاتھ کانوں پر جاتے ہیں۔ میں نے یہی طے کیا

کہ تم چائے پی تو لو گاڑی نکلوا کر میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اور ہوٹل سے سامان لے آؤں گا، تکلف برطرف اس کو اپنا گھر سمجھ کر رہو ایسے شریف آدمی کی جگہ ہوٹل نہیں کسی شریف آدمی کا گھر ہے۔"

ملک صاحب کے ساتھ جا کر ہم ہوٹل سے سامان لے آئے۔

☆☆☆

ایک شریف آدمی کے یہاں ایک شریف آدمی بظاہر نہایت شرافت کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ مگر ہم برابر اسی فکر میں تھے کہ کسی طرح شہر میں کوئی مکان مل جائے اس لئے کہ اس شرافت کا بھرم اسی وقت تک قائم تھا جب تک ملک صاحب کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ ہم بھی نہ صرف بیوی والے ہیں بلکہ اپنی توتلی زبان سے ''ڈیڈی'' کو ''جیڈی'' کہنے والا ایک پھول سا بچہ بھی ہے۔ بے ایمانی تو یہ ضرور تھی کہ ہم اپنا شادی شدہ اور صاحب اولاد ہونا چھپائے ہوئے تھے مگر اس راز کے افشا ہونے کے بعد خانہ بدوشی کا ڈر اس دروغ مصلحت آمیز پر مجبور کئے ہوئے تھا اور اس کے لئے بھی دل طرح طرح کے جواز پیش کرتا رہتا تھا کہ ہم نے ملک صاحب سے یہ کب کہا ہے کہ ہم ان کی صاحبزادی سے شادی کرلیں گے اور ملک صاحب نے ہم سے یہ کب کہا ہے کہ وہ ہم کو اسی مقصد کے لئے اس آؤ بھگت کے ساتھ اپنے یہاں ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی نیت میں فتور کو ہم محسوس کرتے تھے۔ اور یہ بھی ہم کو معلوم تھا کہ اگر آج ملک صاحب کو یہ خبر ہو جائے کہ ہم بیوی بچے والے ہیں تو ہمارا اس گھر میں رہنا ناممکن ہے۔ تانگے والے نے بھی ہم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ملک صاحب بیوی بچوں والوں کو نہیں رکھتے اس کی وجہ بھی معلوم ہو چکی تھی کہ ہم سے پہلے ایک آدھ اور کرایہ دار کو تانگے والا اسی مکان کے لئے جو مکان نہ تھا لا چکا تھا۔ اور ملک صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ امیدوار بال بچوں والا ہے تو نہایت کج خلقی سے جواب دے چکے تھے لہٰذا یہ طے ہے کہ ہماری سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ہم ملک صاحب کے

نزدیک غیر شادی شدہ تھے لہذا غور وفکر کے بعد ہم میں، اس کا امکان موجود ہو سکتا تھا کہ ہم کو غلامی میں قبول کیا جا سکے۔ اور اس غور وفکر کے بعد جتنا جتنا ہم اپنے کو مناسب ثابت کر رہے تھے اسی رفتار سے ہمارے حقوق بڑھ رہے تھے۔

اب تو یہ ملک صاحب کو معلوم نہیں کہ شرح مبادلے کے طے نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان روپیہ نہیں بھیجا جا سکتا۔ البتہ یہ دیکھ کر ان کو مزید اطمینان ہوا کہ ہم نے مہینہ ختم ہونے کے بعد پوری تنخواہ لا کر ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ نوٹوں کی گڈی دیکھ کر بولے۔ ''یہ کیا ہے؟''

عرض کیا۔ ''پہلی تاریخ تھی آج۔ تنخواہ ملی ہے۔''

خوش ہو کر بولے۔ ''خدا مبارک کرے۔ تم نے دی میں نے پائی اب صرف کرو اس کو۔''

ہم نے کہا۔ ''صرف کس کام میں کروں جن ضرورتوں کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ سب تو خود بخود اس طرح پوری ہو جاتی ہیں جیسے جنت کے متعلق سنا ہے کہ دل میں خواہش پیدا ہوئی اور تعمیل سامنے آ گئی۔ اب میری سمجھ میں اس روپیہ کا مصرف نہیں آ رہا ہے۔''

ملک صاحب نے بڑی چالاکی سے فرمایا۔ ''بھئی کسی عزیز کو بھیجنا ہو تو بھیجو......''

ہم نے فوراً بات کاٹ دی۔ ''جی ہاں جن عزیز کو بھیج سکتا ہوں ان کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔''

اور بھی زیادہ خوش ہو کر بولے۔ ''یعنی میں؟ اچھا بھئی لاؤ اس کا فیصلہ نہ میں کر سکتا ہوں نہ تم کر سکتے ہو۔ یہ فیصلہ کریں گی بیگم۔''

اور یہ کہہ کر نوٹوں کی گڈی ہاتھ میں لئے اندر تشریف لے گئے اور تھوڑی ہی دیر میں اندر کے ایک دروازے سے ہمارے کمرے میں تشریف لاتے ہوئے بولے۔ ''لیجئے

صاحبزادے اپنے مقدمہ کی خود پیروی کیجئے عدالت موجود ہے......"

دروازے کی آڑ سے بیگم صاحبہ کی آواز آئی۔ "اچھا وکیل صاحب آپ چپ رہیئے......"

ملک صاحب نے ریشہ خطمی ہوتے ہوئے فرمایا۔ "عدالت کی رعایت سے وکیل کی بھی ایک ہی رہی......"

ہم نے بیگم صاحبہ کی خدمت میں دور ہی سے عرض کیا۔ "میں آداب عرض کرتا ہوں۔"

بیگم صاحبہ نے اپنی آواز کو بے پردہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "جیتے رہو میاں۔ ہزاری عمر پاؤ۔ بھائی یہ روپے کیسے بھیجے ہیں......؟"

ملک صاحب نے ٹوکا۔ "بھائی؟ یعنی شفقت میاں آپ کے بھائی کیسے ہو گئے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا۔ "توبہ ہے تم سے بھی۔ یہ رشتہ نہیں ہے میں نے تو یوں ہی مخاطب کیا ہے...... ہاں تو میاں یہ روپے کیسے بھیجے ہیں۔"

ملک صاحب نے بڑی عمدہ بات کہی۔ "میاں؟......"

بیگم صاحبہ نے ڈانٹا۔ "شرم نہیں آتی تم کو ایسی باتیں کرتے ہوئے، وہی مثل کہ بوڑھے منہ مہاسے لوگ چلے تماشے بچوں کے سامنے چُہلیں سوجھ رہی ہیں......"

ہم نے اس قصہ کو رفع دفع کرتے ہوئے عرض کیا۔ "تنخواہ ملی تھی مجھ کو......"

بیگم صاحبہ نے کہا۔ "وہ تو میں سمجھ گئی مگر یہ نہ سمجھ میں آیا کہ مجھے کیوں بھیجی ہے......"

ہم نے کہا۔ "صرف اپنے کو خوش کرنے کے لئے کہ ہمارا بھی کوئی ہے جس کو ہم تنخواہ دے سکتے ہیں......"

ملک صاحب نے کہا۔ "سن لیجئے بیگم صاحبہ۔ اب تو آپ کو یقین آیا کہ میں جو کچھ کہتا تھا ٹھیک کہتا تھا۔"

بیگم صاحبہ نے کہا۔ ”بیٹے......“

ملک صاحب چیخ اٹھے۔ ”آئیں؟ ... اچھا ان ہی سے کہہ رہی ہو۔ میں بھی کہوں کہ تم کو ہوا کیا ہے۔“

بیگم صاحبہ نے واقعی جھڑکتے ہوئے کہا۔ ”بات کرنے دو گے یا نہیں۔ واہ اچھا تماشہ بنا رکھا ہے۔“

ملک صاحب سہم گئے۔ ”اچھا اچھا تم بات کرو۔“

بیگم صاحبہ نے فرمایا۔ ”میں یہ کہہ رہی تھی شفقت میاں کہ اگر میرا کوئی لڑکا ہوتا تو مجھ کو اس سے جس سعادت مندی کی امید ہو سکتی تھی وہ تم نے پوری کر دی۔ اب یہ میری طرف سے تم قبول کر واور اپنا حساب کسی بینک میں کھول لو۔“

ہم نے کہا۔ ”آپ ہی انصاف کیجئے کہ اب یہ روپیہ میرے کس کام کا جب کام خود بخود ہوتے چلے جائیں تو روپیہ کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔“

بیگم صاحبہ نے کہا۔ ”تو گویا تم اپنے کھانے پینے کا معاوضہ دے رہے ہو۔“

ہمارے بجائے ملک صاحب بولے۔ ”اجی استغفراللہ۔“

اور اب ہم نے کہا۔ ”بخدا یہ جذبہ نہیں ہے۔ آپ مجھ کو غلط نہ سمجھئے۔ میں ہر چیز کا معاوضہ دے سکتا ہوں مگر اس یگانگت اور اس شفقت کا کیا معاوضہ ہو سکتا ہے جو آپ لوگ برت رہے ہیں سوائے اس کے کہ میں خود بک جاؤں۔“

بیگم صاحبہ نے بڑی معنی خیز بات کہی۔ ”ایسی انمول چیز انمول چیز ہی سے بدلی جا سکتی ہے بیٹا اور مجھے خریدنے یا تم کو بکنے کی ضرورت ہی کیا ہے تم تو میرے ہی ہو۔“

ملک صاحب نے فرمایا۔ ”ہاں یہ بات بڑی زور کی کہی تم نے۔ اب فرمایئے مولانا شفقت۔“

ہم نے کہا۔ "تو آخر اتنے سے روپوں کے لئے یہ اتنا بڑا جھگڑا کیا ہے۔"

بیگم صاحبہ نے فرمایا۔ "جھگڑا کچھ نہیں ہے تم نے مجھ کو بھجوائے میرا جی خوش ہوا۔ دل سے دعائیں نکلیں خدا کرے تم ہزاروں لاکھوں کماؤ۔ میری خوشی یہ ہے کہ تم اپنے نام کا حساب کسی بینک میں کھول لو۔"

ملک صاحب بولے۔ "کھل جائے گا حساب۔ کل میں خود جا کر حساب کھلواؤں گا اپنے سامنے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا۔ "اور دیکھو شفقت میاں تم کو میری ہی قسم ہے جو اس حساب میں سے ایک پیسہ بھی کسی اپنی ضرورت پر صرف کرو۔ اور میں نے کہا سنتے ہو...

ملک صاحب نے جو اس وقت ایک کتاب کی تصویریں دیکھنے لگے تھے فرمایا۔ "مجھ سے کہا۔"

بیگم صاحبہ نے کہا۔ "ہاں تم ہی سے کہہ رہی ہوں۔ وہ کپڑے کیا یوں ہی پڑے رہیں گے۔ درزی نگوڑ مارا آخر کب آئے گا۔"

ملک صاحب نے فرمایا۔ "ارے بھئی ان کو دکھا بھی تو دو معلوم نہیں پسند بھی کرتے ہیں یا نہیں بھئی، شفقت میاں بات یہ ہے کہ اس روز یہ ماں بیٹیاں شہر گئی تھیں منجملہ اور چیزوں کے آپ کے لئے بھی کچھ کپڑے لائی ہیں......"

ہم نے کہا۔ "کپڑے تو میرے پاس غالباً کافی تھے ..."

بیگم صاحبہ نے کہا۔ "بیٹا کالج جاتے ہو وہاں ذرا شان سے رہنا چاہئے، کپڑے اللہ رکھے کافی ضرور ہیں مگر میں ایک سوٹ کا اور دو بش شرٹس کے کپڑے اپنی پسند کے لائی ہوں۔"

ملک صاحب نے کہا۔ "جی اور کیا غزالہ نے پسند کئے ہیں سرخرو خود ہو رہی ہیں۔

بہر حال ان کو دکھاؤ تو سہی۔"

کپڑے واقعی نہایت قیمتی ہونے کے علاوہ نہایت صحیح ذوق کے بھی تھے مگر اب دل میں یہ کانٹا اور بھی کھٹکنے لگا کہ یہ جو کچھ جس وجہ سے ہو رہا ہے وہ کتنی غلط توقع ہے۔ کاش کسی طرح جلد سے جلد کوئی مکان مل جائے ورنہ یہ قصہ تو طول ہی پکڑتا جاتا ہے۔

☆☆☆

آج کالج میں بیٹھ کر بیگم کو دلی خط لکھا ہے کہ ہم کس طرح فردوس مکانی بنے ہوئے ہیں۔ ایک ایک بات نہایت تفصیل کے ساتھ اس لئے بھی لکھ دی ہے کہ دل کچھ تو ہلکا ہو۔ انسان اگر اپنے کسی جرم کا اعتراف کرے تو دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ بات بیوی کو تو لکھ سکتے تھے کہ مکان کی مجبوری کیا گل کھلائے ہوئے ہے مگر یہ بات محکمہ آبادکاری والوں کو نہیں سمجھا سکتے کہ تم ہم کو مکان نہیں دے رہے ہو اور ہم اس خوب صورت مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ کھلم کھلا مکان ڈھونڈ بھی نہیں سکتے۔ جب بھی اس قسم کا ذکر آتا ہے ملک صاحب کے یہاں صف ماتم بچھ جاتی ہے اور ملک صاحب کو وہی شکایت شروع ہو جاتی ہے جس کو وہ دل شکنی کہتے ہیں۔ مگر ہماری مصیبت بھی تو دیکھئے کہ نہ مکان ڈھونڈھ سکتے ہیں نہ ملک صاحب کے سامنے بے نقاب آ سکتے ہیں ایک جرم سینکڑوں جرائم کرا رہا ہے۔ ملک صاحب کے احسانات میں دبتے چلے جاتے ہیں اور اپنا انجام روز بروز ہم کو بھیانک ہی نظر آ رہا ہے۔

اب تک تو خیر یہ تھا کہ ظفر صاحب یعنی وہی صاحبزادے جن کی تباہی کا باعث بقول ملک صاحب کے ہوٹل ہوا، ملک صاحب کے یہاں کبھی کبھی آتے جاتے رہتے تھے اور باوجود ناراضگی کے ملک صاحب سے قطعی طور پر بے تعلق بھی نہیں ہو سکتے تھے کہ خدا جانے آخر میں ان ہی حضرت کی ایڑی کے نیچے چوٹی آ جائے تو کیا ہوگا۔ مگر اب نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ آج بھی جب ہم کالج سے واپس آئے تو ظفر صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ ان بیچارے

کو ہم سے جو شکایت ہونا چاہئے تھی وہ تھی کہ یہ کم بخت کہاں سے آ مرا۔ عجیب جلی کٹی اداؤں کے ساتھ ہمارے ساتھ پیش آیا کرتے تھے چنانچہ آج بھی ہم نے ان کو دیکھ کر جب سلام کیا ہے تو ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

’’آپ اور سلام میں سبقت اب یہ سلام کرنے کا حق بھی مجھ سے چھین لیں گے آپ۔‘‘

ہم نے نہایت سچی بات کہی۔ ’’آپ اپنے تمام حقوق محفوظ سمجھئے کم سے کم مجھ سے آپ کو کوئی اندیشہ نہ ہونا چاہئے میں تو سوائے مہمان کے اور کچھ نہیں ہوں۔‘‘

ظفر صاحب نے اپنے تیل لگے ہوئے چھلے دار بالوں کو کچھ اور منتشر کرتے ہوئے فرمایا۔ ’’جی ضرور آپ مہمان ہیں بقول شخصے

ہمارے مہمان جو آئے بن کر وہ ظلم کرنے لگے ہمیں پر
ستم تو دیکھو مکان کے باہر مکان والے پڑے ہوئے ہیں

ہم نے عرض کیا۔ ’’آپ بالکل غلط سمجھ رہے ہیں میری وجہ سے آپ مکان کے باہر نہیں پڑے ہوئے بلکہ آپ کے باہر پڑے رہنے کی وجہ سے شاید میں یہاں پڑا ہوا ہوں۔‘‘

ظفر صاحب آدمی ذرا بیوقوف بھی ہیں غصہ بہت جلد آ جاتا ہے کہنے لگے۔ ’’خیر آپ کسی وجہ سے پڑے رہیں مگر یہ یاد رکھئے گا کہ لاٹھی مارے پانی جدا نہیں ہوا کرتا۔ آپ کا جادو بہت زیادہ نہ چل سکے گا۔ حق حقدار ہی کو ملا کرتا ہے۔‘‘

اب بتائیے اس کا کیا جواب تھا۔ ہم نے ان کی اس بدتمیزی کو پی کر کہا۔ ’’آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو گئے یہاں حق کا تو کوئی ذکر ہی نہ تھا۔ میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں سوائے مہمان کے اور بخدا کچھ بھی نہیں ہوں‘‘

ظفر صاحب نے طنز سے منہ بنا کر فرمایا۔ ’’جیسے آپ مہمان ہیں اس کو آپ بھی

جانتے ہیں اور مجھے بھی گدھا نہ سمجھئے گا میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ ”

ہم نے اب کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ ایسے آدمی سے کوئی معقول آدمی بات ہی کیا کر سکتا تھا۔ لہٰذا خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف رخ کیا مگر وہ حضرت سامنے آ گئے غالباً وہ آج یہ طے کر کے آئے تھے کہ زبردستی ٹکر لیں گے۔ کہنے لگے اور اب یہ بھی سن رکھئے کہ شرافت اور شریفانہ ضبط کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں بڑے صبر اور ضبط سے کام لے رہا ہوں کہ اب تک چپ ہوں مگر آخر کب تک؟

ہم نے اب واقعی اس قابل رحم بے وقوف کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ “ بھائی میرے۔ میں تم کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں کسی صورت میں نہ تمہارا حریف ہوں نہ میری اور تمہاری دلچسپیوں میں کوئی تصادم ہے تم نے جو اندازہ کیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ ”

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ “ اندازہ غلط ہے میرا؟ یہ آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں؟ حضور والا مجھے ایک ایک بات کی خبر رہتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ ہر حیثیت سے میرے قائم مقام بنے ہوئے ہیں۔ جو کمرے آپ کے قبضے میں ہیں ان میں کبھی میں رہا کرتا تھا اب میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہوں۔ اور یہاں آپ کا راج ہے۔ میں بائیسکل پر یہاں آیا ہوں۔ اور آپ اس موٹر پر اڑے پھرتے ہیں جو میرے لئے خریدا گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بڑے میاں آپ کی آؤ بھگت میں کس قدر دیوانے رہتے ہیں اور آپ معہ جوتوں کے میری آنکھوں میں گھس کر فرماتے ہیں اندازہ غلط ہے۔ ”

ہم نے ایک حد تک اس بیچارے کو حق بجانب سمجھ کر سمجھانے کی کوشش کی۔ “ اس بات کا جواب تو آپ کو وقت دے گا کہ میں آپ کے راستہ میں بالکل نہیں ہوں اور جو باتیں بظاہر آپ کو اپنی حق تلفی نظر آ رہی ہیں ان کی ذمہ داری مجھ سے زیادہ غالباً خود آپ پر ہے کہ

آپ نے ملک صاحب کو اپنے سے ناراض کر رکھا ہے۔ بلکہ میں تو اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ اگر آپ اپنے اور ملک صاحب کے درمیان صلح صفائی میں مجھ سے کچھ مدد لینا چاہیں گے تو مجھ کو بڑی خوشی سے اس کے لئے آمادہ پائیں گے......''

ظفر صاحب نے غور سے سن کر نہایت بازاری انداز سے فرمایا۔ ''یار بڑے گھٹے ہوئے کیا میٹھی زبان پائی ہے گویا اب آپ کرائیں گے میرے اور ملک صاحب کے درمیان صلح صفائی؟ کیا بات کہی ہے۔ مان گئے استاد۔ گویا ہم ایسے ہی تو بیوقوف ہیں کہ آپ کو اتنا بیوقوف سمجھ لیں کہ آپ میری خاطر خود اپنے لئے قبر کھود لیں گے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس صلح صفائی کے بعد پھر آپ کی دال یہاں نہ گل سکے گی۔ آپ ایسے ہی تو بھولے ہیں کہ اپنے حق میں کانٹے بھی بوئیں گے۔''

ہم نے واقعی اس سادہ لوح لڑکے پر رحم کھاتے ہوئے کہا۔ ''برادرم تم بخدا بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ نہ میری کوئی دال ہے جو میں یہاں گلانا چاہتا ہوں نہ آپ کے کسی حق پر چھاپہ مارے بیٹھا ہوں۔ میں تو مکان کی جستجو میں یہاں پہنچا تھا اور میں خود حیران ہوں کہ ایک اجنبی کے ساتھ ملک صاحب کی ان نوازشات کے آخر کیا معنی ہیں۔''

ظفر صاحب نے ہنس کر فرمایا۔ ''آپ نہیں جانتے۔ بالکل نہیں جانتے؟ پھر تو آپ واقعی عجیب چیز ہیں۔ صاحب اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ملک صاحب کو اپنی دختر نیک اختر کے لئے ایک ایسے بیوقوف کی ضرورت ہے جس کو وہ اپنے اصطبل میں باندھ لیں۔ مجھ سے ناراضگی کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کی صاحبزادی کی امید میں مجھ سے ان کے اشاروں پر ناچا نہ گیا مگر آپ ٹھہرے چالاک آدمی آپ نے چند ہی دن میں ان کو ایسا شیشے میں اتارا ہے کہ سواری کے لئے موٹر ہے خدمت کے لئے نوکر چاکر ہیں خود ملک صاحب آنکھیں بچھاتے ہیں ان کی میم صاحبہ بھی جناب ہی کا کلمہ پڑھتی ہیں۔ یہ تو سب کچھ درست ہے مگر جب تک

میرے دم میں دم ہے میں آپ کو اس آسانی کے ساتھ کامیاب نہ ہونے دوں اور اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ میں آپ کی ان چکنی چپڑی باتوں میں آ کر چکمہ کھا جاؤں گا تو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں واقعی ایسا گدھا نہیں ہوں۔“

ہم نے عاجز آ کر کہا۔ ”آخر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔“

ظفر صاحب نے فرمایا۔ ”چاہتا میں کچھ نہیں ہوں۔ صرف آپ کو یہ بتا دیا ہے کہ اگر اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو ہاتھیوں سے گنا کھانے کا شوق نہ فرمائیے گا۔

ہم نے بھی اب اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر کہا۔ ”آپ کے مشورے کا شکریہ جب کبھی ایسا ارادہ ہوگا میں آپ کے مشورے پر غور کروں گا۔“

اور اب واقعی ہم اس اوندھی کھوپڑی والے انسان سے سر نہ کھپا سکے۔ تیزی کے ساتھ اپنے کمرے میں جو داخل ہوئے تو میاں غفور کو جو ہماری خدمت پر ملک صاحب کی طرف سے مامور تھے دروازے سے لگا ہوا پایا۔ غفور نے ہم کو دیکھتے ہی ایک مرتبہ باہر جھانکا اور پھر ہمارے قریب آ کر کہا۔

”صاحب میں نے سب باتیں سن لی ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں اس کے کاٹے کا منتر نہیں ہے اور یہ تو اچھا ہی ہوا کہ میں نے خود اس کی باتیں سن لی ہیں اب میں ذرا ہوشیار رہوں گا۔ اس نے ڈسنے کے لئے پھن اٹھایا ہے تو جانے کب حملہ کر بیٹھے جس کو اپنی عزت آبرو کا خیال نہ ہو وہ سب کچھ کر سکتا ہے چھٹا ہوا غنڈا ہے یہ۔“

ہم نے بے پروائی سے غفور سے کہہ دیا۔ ”تم کچھ فکر نہ کرو اس قسم کے لوگ نقصان پہنچانے کے بجائے نقصان اٹھاتے ہیں۔ بیوقوف ہے یہ لڑکا۔“

غفور نے کہا۔ ”بیوقوف نہ ہوتا تو آج یہ حالت کیوں ہوتی۔ آج پتہ چل گیا ہوگا سرکار گاؤں گئے ہوئے ہیں اس لئے آ گیا آپ سے الجھنے نہیں تو اس کی مجال تھی۔ مگر صاحب

اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔'

ہم نے غفور کو بہت کچھ سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا ورنہ وہ بے حد متاثر نظر آ رہے تھے عجیب و غریب چیز واقع ہوئے ہیں یہ حضرت بھی صرف خدمت ہی نہیں کرتے بلکہ اس خدمت میں مامتا بھی شامل رہتی ہے رات کو پڑھنے کے لئے بیٹھ جایئے دو تین مرتبہ اپنا بستر چھوڑ کر آئیں گے کہ صاحب رات زیادہ آ گئی ہے جاگنے سے کہیں طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ کھلائیں گے تو مسلسل اصرار ہوگا کہ کچھ تو خوراک بڑھانے کی کوشش کیجئے دماغی کام کرتے ہیں آپ اور یہ خوراک ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے لئے آج کا واقعہ کافی تشویش انگیز تھا مگر ہم نے ان کو سمجھا بجھا کر چائے لانے کے لئے بھیج دیا اور چائے کے بعد دوسرے کاموں میں لگا دیئے گئے مگر اس وقت جب کہ ہم یہ ڈائری لکھ رہے ہیں وہ تین مرتبہ آ کر کمرے میں جھانک چکے ہیں مطلب یہ ہے کہ بس اب سو رہو رات زیادہ آ گئی ہے۔

☆☆☆

ملک صاحب کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر آج ہم صبح نو ہی بجے گھر سے ٹہلتے ہوئے چل کھڑے ہوئے۔ وہ ایک میل کا یہ بیہودہ راستہ جو موٹر میں بیٹھ کر اتنا بیہودہ محسوس نہیں ہوتا جتنا دراصل ہے۔ پیدل ہی طے کیا نتیجہ یہ کہ جس وقت بس اسٹینڈ پر پہنچے ہیں جوتوں پر نظر پڑتے ہی محسوس ہوا کہ گویا غلطی سے غفور کے جوتے جلدی میں پہن آئے ہیں۔ جب زمین پر متعدد مرتبہ پیر مارے اور گرد کچھ چھٹی تو اس جوتے میں کچھ کچھ یگانگت کے آثار پیدا ہوئے اب کھڑے ہوئے بس کا انتظار کر رہے ہیں معلوم یہ ہوا کہ واقعی اگر اس بس کے سہارے کالج پہنچنے کا مستقل پروگرام بنا لیا جائے تو یہ کچھ ضروری نہیں کہ کالج کھلنے ہی کے وقت پہنچ سکیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کالج بند ہونے کے وقت ہم وہاں تک پہنچ سکیں اور اس کا بھی امکان ہے کہ نہ بھی پہنچ سکیں اس لئے کہ یہ مسافروں پر منحصر ہے کہ وہ کس تعداد میں سفر کی ٹھانتے ہیں مثلاً اسی وقت ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی دو بسیں نہ صرف گزر گئیں بلکہ ان کے مسافر ہم پر ہنسے بھی مگر خدا کا شکر ہے کہ تیسری بس نسبتاً خالی پہنچی نسبتاً سے مطلب یہ ہے کہ بیٹھنے کی نہ سہی کھڑے ہونے کی جگہ مل گئی اور ہم ٹھیک اس وقت کالج پہنچ گئے جب پہلا گھنٹہ گزر چکا تھا اور جب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ پرنسپل سے جا کر کم سے کم یہ کہہ دیں کہ اسپتال سے حلق میں دوا لگواتے ہوئے آئے ہیں ورنہ آواز ہی نہ نکلتی تھی۔ اور طے یہ کر رہے تھے کہ کل بجائے نو بجے کے آٹھ بجے بس اسٹینڈ پر پہنچ جائیں گے اور کوٹ کی ایک جیب میں اگر رومال رکھیں گے تو دوسری ''شومال'' ضرور

رکھیں گے۔ رہ گئی واپسی اس کی اتنی فکر نہ تھی اس لئے کہ ملک صاحب کے یہاں کوئی حاضری کا رجسٹر تو ہوتا نہیں کہ وقت کی پابندی سے واپس پہنچیں۔

کالج کے وقت ختم ہونے کے بعد بس کے تصور کو ذہن میں بسائے ہوئے باہر نکلے ہی تھے کہ ملک صاحب کے ڈرائیور میاں رحیم نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ ہم نے حیرت سے کہا۔

"رحیم تم کیسے آگئے؟"

رحیم نے بڑی تشویش سے کہا۔ "سرکار نے تو سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے جب سے ان کو معلوم ہوا کہ آپ گاڑی نہیں لے گئے مجھ سے کہا ہے کہ فوراً گاڑی لے کر پہنچو ایسا نہ ہو کہ آپ کو واپسی میں بھی تکلیف ہو۔"

ہم نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ملک صاحب واپس کب آئے؟"

رحیم نے کہا۔ "وہ تو بارہ بجے ہی آگئے تھے اور بس اسی کے بعد سے تحقیقات ہو رہی ہیں کہ آپ آخر بغیر گاڑی کے کیوں گئے۔ غفور نے شاید کچھ باتیں کی ہیں اس کے بعد سے اور بھی غصہ ہے۔"

اور ہم سمجھ گئے کہ غفور سے اس تحقیقات کے سلسلہ میں جب باز پرس ہوئی ہوگی تو حضرت نے ظفر صاحب کی تشریف آوری اور ہم سے الجھنے کا قصہ ضرور کہہ سنایا ہوگا۔ اور اب ہم راستے ہی میں اپنے کو جواب دہی کے لئے تیار کرنے لگے کہ ظفر صاحب والے واقعہ کے متعلق اگر پوچھ گچھ ہو تو کس طرح ایسا بیان دیں کہ ظفر صاحب کی شکایت کا کوئی پہلو اس سے نہ نکلے۔ اپنے نزدیک بہت کچھ تیار ہو کر جب ہم کوٹھی میں داخل ہوئے تو ملک صاحب کو اپنے ہی انتظار میں ٹہلتے ہوئے پایا۔ ہم کو دیکھتے ہی ایک نعرہ آپ نے بلند فرمایا۔

"یعنی یہ کیا واہیات حرکت کی ہے کہ بغیر موٹر کے آج چلتے ہوئے۔"

ہم نے بات بنائی۔ "وہ ہوا یہ کہ میرے ایک ساتھی پروفیسر رضوی صبح آگئے تھے ان

ہی کی گاڑی میں چلا گیا تھا۔"

آنکھیں نکال کر بولے۔ "غلط۔ مجھے سب معلوم ہے۔ آپ صبح نو بجے گھر سے نکلے۔ پیدل بس کے اڈے تک گئے، خاک چھانتے اور بڑی امیدواری کے بعد آپ کو ایک گھنٹہ بھر کے بعد بس ملی۔ میرا مخبر آپ کے ساتھ ساتھ تھا بندہ نواز۔"

ہم نے ہنس کر کہا۔ "جب آپ کی سی آئی ڈی ایسی ہی زبردست ہے تو جھوٹ بولنا ہی گویا بیکار رہا۔ بات یہ ہوئی کہ میں نے سوچا کہ آج ذرا یہ تو اندازہ کر کے دیکھوں کہ اگر آپ مجھ پر ایسے ہی مہربان نہ ہوتے تو میں کس طرح جایا کرتا۔"

اسی تیئں کے ساتھ پھر فرمایا۔ یہ بھی غلط ہے۔ آپ یہ اندازہ کرنے کے لئے نہیں گئے تھے بلکہ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے کہ کل وہ الو کا پٹھا یہاں آیا تھا۔ اور آپ سے کافی بدتمیزیاں کر کے گیا ہے۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ نے اسی وقت کسی نوکر سے یہ کیوں نہ کہا کہ اس کا کان پکڑ کر باہر نکال دے۔ بڑا بہادر بنتا ہے تو میری موجودگی میں کیوں نہیں آتا۔ اور آپ ایسے عقلمند کہ اس شہدے کی باتوں میں آ گئے حضرت میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ وہ نامعقول لڑکا اپنی اصلیت کو بھول چکا ہے۔ اس کا علاج تو صرف یہ تھا کہ اتارا ہوتا جوتا تم نے اور علی الحساب شروع کر دیتے اس بدمعاش کی تاجپوشی۔ استغفراللہ۔"

اور پھر غفور سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "کان کھول کر سن لو کہ اب اگر میں نے یہ سنا کہ وہ مردود ازلی پھر اس مکان کے آس پاس نظر آیا ہے تو تمہارے حق میں مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

ہم نے کہا۔ "آپ کو شاید کچھ ایسی باتیں بتائی گئی ہیں جن سے آپ مشتعل ہو گئے ہیں، میں خود تفصیل سے عرض کروں گا کہ ایسی خدانخواستہ کوئی بات نہ تھی۔"

ملک صاحب نے ان ہی بھرے ہوئے تیوروں سے فرمایا۔ "بات تھی یا نہیں مگر وہ یہاں نہیں آ سکتا۔ بہرحال آپ چل کر کپڑے وپڑے بدلئے اور پھر بیگم صاحبہ کو سمجھائے گا

جو مجھ سے زیادہ کھول رہی ہیں اس واقعہ کو سن کر۔ میاں اگر تم کل اندر ہی کہلوا دیتے تو میری بیوی تمہارے سر عزیز کی قسم وہ دم میں نمدا باندھتی اس لفنگے کے کہ وہ بھی کیا یاد کرتا۔ وہ تو کہتی ہیں کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا۔"

عرض کیا۔ "میں ان کو بھی سمجھا دوں گا آپ لوگوں کو واقعی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

ملک صاحب کو اس طرح پیچ و تاب کھاتا چھوڑ کر ہم اپنے کمرے میں چلے گئے، کپڑے بدل کر ہاتھ منہ دھویا اور چائے کی میز پر جو آئے تو ملک صاحب نے بلند آواز سے فرمایا لیجئے تشریف لے آئے ہیں، آپ کے صاحبزادے۔"

اور اندر سے بیگم صاحبہ کی آواز آئی۔ شفقت میاں کمال کر دیا تم نے آج بغیر موٹر ہی کے چلتے بنے۔ اور بیٹا کل والے قصے کی تو مجھے خبر تک نہ ہوئی کہ ظفر نے آ کر تم سے ایسی بدتمیزی کی۔"

ہم نے نہایت خوب صورتی سے تعجب کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ سے کس نے کہہ دیا ہے کہ بدتمیزی کی اس بیچارے نے۔"

ملک صاحب ابل پڑے۔ "بیچارہ؟ یعنی وہ اور بیچارہ، میاں حد ہے اگر تم اس نانجار کو بیچارہ کہہ رہے ہو۔"

بیگم صاحبہ بولیں۔ "سچ مچ تمہاری شرافت کی حد ہے کہ تم اس کم بخت کو بیچارہ کہہ رہے ہو۔ ارے بیٹا وہ تو اعلیٰ درجہ کا شہدہ نکل گیا۔

ہم نے کہا۔ "صاحب مجھے تعجب ہے کہ آپ لوگوں کی رائے ان کے متعلق اس قدر خراب ہے۔ وہ کل نہایت ندامت کے ساتھ مجھ سے یہی کہہ رہے تھے کہ انسان ٹھوکریں کھا کر کچھ سیکھتا ہے۔ میں نے بھی ٹھوکریں کھا کر بہت کچھ سیکھا ہے اور اب مجھ کو احساس ہو رہا ہے کہ میں نے اپنے کتنے بڑے محسن کو دکھ دیا ہے۔"

ملک صاحب نے گرج کر کہا۔ ''کس نے کہا۔ ظفر نے؟ ناممکن، اس کے باپ نے بھی ایسا شریفانہ اور اتنا مہذب لب ولہجہ کبھی کسی سے اختیار نہ کیا ہوگا۔''

ہم نے کہا۔ میں جو آپ سے عرض کر رہا ہوں۔ بلکہ میں تو آپ سے خود عرض کرنے والا تھا کہ اگر بجائے اس تنفر کے آپ ایک مرتبہ ان کو بلا کر محبت سے گلے لگالیں تو شاید آپ کو ان میں بڑی تبدیلیاں نظر آئیں گی۔''

غفور صاحب اب تک تو خاموشی سے کھڑے چائے کی میز پر کھیاں جھل رہے تھے مگر اب ان سے ضبط نہ ہو سکا کہنے لے۔ ''صاحب اب میں کیا کہوں چھوٹا منہ بڑی بات والا قصہ ہے مگر میں نے کل ان کی ایک ایک بات خود اپنے کانوں سے سنی ہے۔''

ہم نے غفور صاحب کو ٹالتے ہوئے کہا۔ ''نہیں شاید تم کو غلط فہمی ہوئی ہے وہ مجھ کو بے حد منفعل نظر آرہے تھے۔''

بیگم صاحبہ نے ملک صاحب کو مخاطب کیا۔ ''میں نے کہا سنتے ہو۔ اگر یہ سچ کہہ رہے ہیں تو آخر نقصان ہی کیا ہے۔ ذرا اس کو بلوا کر اندازہ تو کیا جائے۔''

ملک صاحب نے بدستور بیزاری سے کہا۔ ''اجی میں اس کے رگ وریشہ سے واقف ہوں، میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں کہ وہ ایسا شریف زادہ بن سکتا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''آپ میری خاطر سے ایک مرتبہ ان کو بلا کر اپنی شفقت کا ان کو یقین دلا دیجئے اور پھر دیکھئے کہ ان میں آپ کو کچھ تغیر کچھ اصلاح اور کچھ انسانیت کے آثار نظر آتے ہیں یا نہیں۔''

بیگم صاحبہ نے بھی زور دیا۔ ''ہاں ہاں اس میں نقصان ہی کیا ہے۔ کیا عجب ہے کہ اللہ نے نیکی ڈال دی ہو اس کے دل میں۔''

ملک صاحب نے فرمایا۔ صاحب میں تو اس کو معجزہ سمجھوں گا۔ بخدا میرا جی نہیں چاہتا

کہ میں اس کو بلاؤں مگر آپ لوگ یہی چاہتے ہیں تو یہ بھی کر دیکھوں گا۔"

میاں غفور سے جب ضبط نہ ہو سکا۔ تو وہ چائے کی میز کو مکھیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ رات کو کھانے کی میز پر بھی نہ آئے اور اس وقت جبکہ ہم حسب معمول ڈائری لکھ رہے ہیں وہ اپنی عادت کے خلاف کمرے میں متعدد مرتبہ کیا ایک مرتبہ بھی نہیں جھانکے۔ غالباً بے حد خفا ہیں۔

☆☆☆

ہماری ڈاک کالج کے پتہ پر آیا کرتی تھی اور ہم خطوط بھی کالج ہی میں بیٹھ کر لکھا کرتے تھے ملک صاحب کے گھر میں تو اسکا امکان ہی نہ تھا اور نہ یہ قرین مصلحت تھا کہ گھر کے پتہ پر ڈال آیا کرے یا ہم اتنے خط ملک صاحب کے گھر میں بیٹھ کر لکھا کریں۔ عالم یہ تھا کہ روزانہ ایک خط بیگم کو ہم لکھتے تھے اور روزانہ ایک خط ان کا آتا تھا ان کے خط کے علاوہ کبھی خسر صاحب محترم و معظم کا خط آ گیا۔ کبھی کسی ہمشیرہ نسبتی کا والا نامہ کبھی کسی نقل پر دانہ کا عنایت نامہ گویا ان میں سے اگر ایک خط بھی کبھی پکڑ لیا جاتا تو ملک صاحب کے در دولت کی ہمارے لئے وہ حالت ہو سکتی تھی جو ''سم سم'' کا نام بھول کر الہ دین کی ہوئی تھی۔ ہمارا معمول یہ تھا کہ کالج پہنچتے ہی دفتری کے پاس جاتے اور اس سے اپنی ڈاک لے کر اپنے کمرے میں آ جاتے تھے اور کبھی اتفاق سے بیگم کا خط نہ ملا جس کی بے شمار وجوہ ہو سکتی ہیں۔ نہ معلوم یہ ہوتا تھا کہ گویا آج کا دن زندگی کے حساب میں شامل نہیں رہا۔ کچھ عجیب تکدر سا دن بھر رہتا۔ جی چاہتا کہ آج ایک کے بجائے بیگم کو دو خط لکھ دیں اور اکثر واقعی ایسا کیا بھی اس کے دراصل دو سبب تھے، ایک تو یہ خود اپنے دل کو ذرا اطمینان ہو جاتا تھا دوسرے ایک عقل مندی جو کر بیٹھے تھے اس کا خمیازہ بھی اسی صورت سے بھگتنا پڑتا ہے۔ عقلمندی یہ سرزد ہوئی تھی کہ بیگم صاحبہ کو مارے دیانتداری کے ملک صاحب کے یہاں کا سارا کچا چٹھا لکھ مارا تھا کہ یوں وہاں پہنچے اور اس غلط فہمی میں ملک صاحب کو مبتلا کر دیا کہ ہم 'واحد حاضر' ہیں اور ''جمع غائب'' بھی یعنی عالم یہ ہے کہ

پڑے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مرجائے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اور یہ یقین دلانے کے بعد جو آؤ بھگت ہماری ہو رہی تھی اس کا تفصیلی حال روز کا روز لکھ دیتے تھے۔ مگر ہم یہ بھول گئے تھے کہ بیگم لاکھ سمجھ دار ہوں لاکھ عقلمند ہوں مگر یہ آخر عورت اور اس قسم کے معاملات میں عورت کچھ بہت ہی عورت بن جایا کرتی ہے۔ چنانچہ اگر ڈاک کی گڑبڑ، ہوائی جہاز کے حادثے، پوسٹ مین کی غفلت یا کسی ایسی ہی ناگہانی وجہ سے کسی دن بھی ہمارا خط ناغہ ہوا اور بیگم صاحبہ نے طے کر لیا کہ آج خط نہ آنے کے معنی یہ ہیں کہ پرسوں ملک صاحب کی صاحبزادی سے نکاح ہو گیا، دولہا بنے ہوں گے، شادی کی مصروفیت میں کہاں مجھ کو خط لکھنے بیٹھتے، اب یہ خیال دماغ میں بسائے دن ہے تو کھولتی پھر رہی ہیں اور رات ہے تو بستر پر جیسے کانٹے بچھے ہوئے ہیں نہ اس کروٹ چین نہ اس کروٹ۔ حالانکہ وہ اپنی اس کیفیت کا اظہار خطوط میں نہیں فرماتیں مگر ہم کو معلوم ہے جو ان کا حال ہوتا ہوگا چنانچہ آج بھی اس نیک بخت کا خط اپنے کم بخت کے نام آیا ہے اس سے یہ کیفیت تھوڑی بہت چھانی جا سکتی ہے۔"

"سرکار۔ کل کا عالم کچھ نہ پوچھئے۔ مگر خدا کا ہزار شکر ہے کہ آج آپ کا خط مل گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خط بھی مل گیا جو آج ہی ملنا چاہئے تھا۔ ان دونوں خطوں کو پڑھ کر اپنے اوپر بے حد ہنسی آئی یعنی کل جتنے خیالات آئے تھے وہ سب ختم ہو گئے مگر آپ نے اپنے دونوں خطوں میں سے کسی میں یہ نہیں لکھا کہ اب تک ان صاحبزادی کی بھی کوئی جھلک نظر آئی یا نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ خود تاکا جھانکی کی کوشش کریں بلکہ میرا خیال اس طرف یوں گیا کہ وہ ملک صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ جو اپنی صاحبزادی کے لئے اتنے جتن کر کے بر ڈھونڈ رہے ہیں بلکہ اپنے نزدیک ڈھونڈ چکے ہیں یہ بھی کر سکتے ہیں کہ کسی بہانے

سے آپ کو لڑکی دکھا دیں بلکہ مجھ کو تعجب ہے کہ اب تک لڑکی دکھائی کیوں نہیں، میرا خیال یہ ہے کہ ہونہ ہو لڑکی میں یا تو کوئی جسمانی فتور ہے یا وہ بدشکل ہے ورنہ داماد خریدنے کے کیا معنی۔ بہرحال آپ کو اس سے کیا جس کو ملک صاحب کا داماد بننا ہو وہ یہ باتیں سوچے، البتہ یہ میں ضرور کہوں گی کہ خدا کے واسطے آپ مکان کی تلاش میں ذرا بھی کوتاہی سے کام نہ لیں۔ جو کچھ بھی ہو مکان فوراً ملنا چاہئے، اس لئے کہ آپ نہایت نامناسب طریقہ پر نہایت نامناسب جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں اور جب سے آپ نے اپنے لٹھی رقیب ظفر کا حال لکھا ہے۔ مجھے اور بھی فکر پیدا ہوگئی ہے کہ نہ جانے یہ موا انگوڑ مارا کیا کر گزرے۔ بھئی خدا کے لئے آپ تو ہوٹل ہی میں چلے جائیں۔ بھاڑ میں گئے موئے ملک صاحب اور ان کے مکان کی خاطر مدارات، آپ بھی عجیب عذر ہیں کہ اگر کھل گیا ملک صاحب پر یہ راز تو کیا ہوگا دوسرے میں آپ سے سچ کہتی ہوں کہ اب میں ایک منٹ کے لئے بھی یہاں رہنا نہیں چاہتی طبیعت ہر وقت اچاٹ رہتی ہے اور اب تو میری صحت پر ان ویرانیوں کا اثر ہو رہا ہے۔ آپ نے کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ آپ کتنے بڑے جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں اتنا بڑا جھوٹ بول کر خدا کرے آپ اس خط کے جواب میں یہ لکھ دیں کہ آپ ہوٹل میں آگئے ہیں۔

آپ کا فردوس ماشاءاللہ اچھا ہے آج آپ کی تصویر دیکھ کر کہہ رہا تھا ''ابا، کو کو پھک پھک'' باتیں کرتے کرتے تصویر پر منہ رکھ کر سو گیا اور اس منظر کو دیکھ کر میرے آنسو نکل پڑے۔ میں ڈرتی ہوں میرا بچہ آپ کو یاد کرتے کرتے اللہ نہ کرے بیمار ہو جائے۔ لیجئے اس کی عمر دراز وہ ٹھنک رہا ہے سو چکا اب ختم کرتی ہوں خدا کرے صبح آپ کا خط پھر مل جائے۔

آپ کی بلقیس

واقعی عورت خواہ وہ ہماری بیوی ہو یا کسی اللہ کے بندے کی بیوی، جب اپنے عورت پن میں آتی ہے تو سخت قابل رحم بن جاتی ہے، اب گویا بیگم صاحبہ کو یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں

ملک صاحب کی صاحبزادی کی جھلک نہ ہم دیکھ لیں، یہ بھی ہم کو سمجھانے کی کوشش ہو رہی ہے کہ وہ بدصورت ہوگی تاکہ یہ خواہش ہمارے دل میں کم از کم پیدا نہ ہو اور سو باتوں کی ایک بات تو یہ کہ وہ ہرگز نہیں چاہتیں کہ ہم ملک صاحب کے یہاں رہیں اور یہ سب کچھ ہوا ہے ہماری اس عقلمندی کی بدولت کہ ہم نے بیگم صاحبہ کا عورت ہونا بھول کر ان کو سب کچھ لکھ دیا۔ یہ سچ ہے بقول بیگم کے ہم سے یہ مجرمانہ حرکت سرزد ہوئی ہے کہ ہم نے ملک صاحب کو بیوی کا قصہ ہی نہ بتایا اور تانگے والے کے مشورے پر عمل کر کے ایسا جھوٹ بول گئے جو اب بلائے جان بنا ہوا تھا مگر سوال تو یہ ہے کہ یہ نہ کرتے تو کرتے کیا۔ اب بیگم کو کیا معلوم جس ہوٹل سے بھاگے ہیں اس کی مسہری میں کتنے کھٹمل تھے اس ہوٹل کے سالن کے ایک پیالے میں کتنے گیلن پانی ہوتا تھا۔ اس ہوٹل کی روٹی میں کتنی ریت ہوتی تھی اور کتنا آٹا اور اس ہوٹل میں رہ کر ہمارا وزن کتنا گھٹ گیا تھا۔ وہ تنخواہ جو اب سب کی سب بینک میں جمع ہو رہی تھی ہوٹل والے، تانگے والے اور سینما والے آپس میں مل کر بانٹ لیتے تھے اور مہینہ کی آخری تاریخوں میں جی چاہنے لگتا تھا کہ چلو کسی کی جیب کاٹیں پھر یہ کہ روز کوئی نہ کوئی ہنگامہ موجود ہے۔ آج کسی کے کمرے میں چوری ہوگئی ہے، تھانیدار صاحب ایک کرسی پر بیٹھے ہوٹل کے ملازم کا بیان لکھ رہے ہیں اور شک کی نظریں ہوٹل کے ہر مسافر پر ڈال رہے ہیں۔ آج ہوٹل میں کوئی صاحب پکڑے گئے جن کی بیوی کے اصل شوہر معہ پولیس کے آموجود ہوئے اور اب پتہ چلا کہ یہ دراصل مسافر موصوف کی بیوی نہیں بلکہ صرف پڑوسن تھیں کچھ نہیں تو یہی مصیبت کیا کم ہے ہم اپنے کمرے میں کچھ پڑھ رہے ہیں اور برابر کے کمرے میں کوئی صاحب نشہ میں چور شام سے صرف ایک ہی مصرعہ حلق پھاڑ پھاڑ کر گا رہے ہیں کہ ؎

لارے لپا، لارے لپا۔ لائی رکھدا

اور دوسرے کمرے میں کچھ لوگ نہ جانے کیا کر رہے ہیں کہ ہر دوسرے تیسرے

منٹ پر فلک شگاف قہقہوں کے ساتھ تالیوں کی وہ قیامت خیز آواز آجاتی ہے کہ جو کچھ آدمی پڑھ چکا ہو وہ ایک دم سے بھول جائے۔ جن ہوٹلوں میں اس قسم کی باتیں نہیں ہوتیں ان پر ایک خدا کی مار یہ ہے کہ کرائے اتنے زیادہ ہیں کہ ہمارا ایسا آدمی اگر ایک مہینہ وہاں رہنے کی صورت نکال لے تو کم از کم چھ مہینے جیل میں رہنا پڑے۔ ایک طرف ان مصیبتوں کو دیکھئے دوسری طرف یہ خیال فرمایئے کہ ملک صاحب کے یہاں سوائے ٹھہرنے اور ٹھہر کر بصیغہ راز دوسرا مکان ڈھونڈنے کے باقی ہماری نیت بخیر تھی ملک صاحب خود کیا سمجھ بیٹھے تھے اس کی ذمہ داری خود ان پر تھی اور اب تو ہم نے ایسی صورت بھی پیدا کر دی تھی کہ ان کے اصل بلکہ ٹرینڈ داماد ظفر صاحب سے بھی صلح ہو سکتی تھی۔ بشرطیکہ اس سر پھرے لونڈے کو خدا عقل دے دے لہٰذا یہ اور بھی ہماری نیک نیتی کا ثبوت ہے۔

بیگم صاحبہ کے اس خط سے ہم نے کافی عبرت پکڑنے کی کوشش کی اور ہمارے ضمیر نے بھی بیگم صاحبہ ہی کی تائید کی مگر اس سوال کا کوئی حل سمجھ میں نہ آیا کہ آخر ملک صاحب کے یہاں سے دفع کہاں ہو جائیں۔ بہر حال بیگم کو سمجھا بجھا کر خط لکھا اپنی پاکیزگی نفس کے لئے بڑے بڑے حلف اٹھائے اور اس خط میں ایک مرتبہ پھر خدا کو حاظر و ناظر جان کر وعدہ کیا کہ آج سے مکان کی جستجو ایک تازہ گرمجوشی کے ساتھ شروع کر دی جائے گی اور مکان خواہ وہ کیسا ہی مکان ہو یا مکان کی تہمت بہر حال اس کا مل جانا شرط ہے اس کے ملتے ہی ملک صاحب کے یہاں سے اگر رخصت ہو سکے تو خیر ورنہ فرار اختیار کریں گے۔ خط میں یہ تمام باتیں اوپری دل سے اور محض بیگم کو مطمئن کرنے کے لئے نہ لکھی تھیں بلکہ واقعی ارادہ بھی یہی تھا کہ یہ روز کا ملک صاحب کے یہاں سے موٹر پر آنا اور موٹر پر واپس جانا غلط ہے اس طرح تو ہم قیامت تک مکان نہیں ڈھونڈ سکتے۔ چنانچہ آج کالج کا وقت ختم ہونے سے پہلے ہی یعنی موٹر پہنچنے سے پہلے ہی ہم نے کالج چھوڑ دیا۔ پہلے تو سیدھے ڈاک خانے گئے اپنے

ہاتھ سے خط پوسٹ کیا اس کے بعد اس طرح ایک سڑک کو ہو لئے گویا اسی پر مکان ہمارا منتظر ہے جس کی ہم کو تلاش ہے حالانکہ یہ بھی پتہ نہ تھا کہ یہ سڑک جا کدھر رہی ہے مگر وہ جو کسی نے کہا ہے نا کہ۔

ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

دل نے کہا ہمارا کام صرف جستجو ہے۔ مکان کا ملنا یا نہ ملنا یہ سب تقدیری امور ہیں۔ آج کی جستجو میں اتنا تو ضرور ہوا کہ مختلف نئے راستوں سے واقف ہو گئے۔ عجیب عجیب سڑکیں اور گلیاں نظر سے گزریں جن میں سے بعض گلیاں تو ایسی نکلیں کہ گھما پھرا کر پھر وہیں پہنچا دیا جہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ ہوا مگر مکان ڈھونڈنے کا شاید یہ طریقہ ہی نہیں۔ چنانچہ جب رات کو ملک صاحب سے بے شمار جھوٹ بول کر بستر پر لیٹے ہیں تو کچھ اپنی ہی حماقت کا احساس ہو رہا تھا کہ کیا خوب ڈھونڈھا ہے مکان۔

☆☆☆

لہلہاتا ہوا باغ، چاروں طرف سرخ سرخ گلاب کے پھولوں کی کیاریاں، وسط سبزہ زار میں فوارہ، حوض میں رنگ برنگ مچھلیاں، تاج محل کے نقشہ کی سی کوٹھی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سانچے میں ڈھال کر رکھ دی گئی ہے۔ پھر مقدر ملاحظہ ہو کہ اعلیٰ درجہ کا فرنیچر، ایرانی قالین، لچکدار صوفے، ریشمی پردے، جہاں قالین نہیں ہیں وہاں فرش ایسا کہ اگر آئینہ نہ ہو تو فرش کو دیکھ کر داڑھی بنالی جائے۔ غسل خانہ ایسا کہ زندگی بھر آدمی نہاتا ہی رہے، برآمدے میں ہمارا سامان اتر رہا ہے اور ہم کوٹھی کا ایک ایک کمرہ مالک مکان کے ساتھ دیکھتے پھرتے ہیں۔ وہ نورانی صورت کے سفید ریش بزرگ سراپا اخلاق بنے گویا بچھے ہی جاتے ہیں۔

”ملاحظہ ہو بندہ نواز یہ گرم پانی کا نل ہے اور یہ ٹھنڈے پانی کا۔“

عرض کیا۔ ”یہ سب کچھ درست ہے مگر اب آپ کرایہ بھی فرمائیں تاکہ دل کو ایک کھوج سی ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔“

بڑی شگفتگی سے بولے۔ ”کرایہ جو جی چاہے دے دیجئے گا دس بیس پچاس جو سمجھ میں آئے۔“

عرض کیا ”پھر بھی کچھ معلوم تو ہو بات یہ ہے کہ میں معاملہ کا بہت صاف آدمی ہوں۔ ایک مرتبہ تجارتی صاف گوئی سے کام لے کر کرایہ بتادیجئے پھر برتنے کو ساری عمر پڑی ہے۔“

بزرگ محترم نے بدستور شگفتگی کے ساتھ فرمایا۔ ”آپ زیادہ سے زیادہ کیا دے سکتے ہیں؟“

عرض کیا۔ ”صاحب بات یہ ہے کہ اس کوٹھی اور کوٹھی کے اس سامان کا کرایہ تو خیر میں

ادا کر ہی نہیں سکتا یہ تو مجھ کو اوقات سے باہر نظر آ رہی ہے البتہ میں کرایہ کی مد میں زیادہ سے زیادہ سو روپیہ ماہوار کا متحمل ہو سکتا ہوں اس سے زیادہ نہیں۔"

مسکرا کر ان بزرگ نے فرمایا۔"سو روپے؟ چلیے منظور ہے۔" اپنا ہی گھر سمجھ کر رہیے......"

اور یہ کہہ کر اتنی زور سے چمٹا کر جھنجھوڑا ہے ہم کو مارے محبت کے کہ آنکھ کھل گئی...... نہ وہ کوٹھی نہ ڈہ اس کا سامان نہ وہ بزرگ، وہی ملک صاحب کا مکان وہی ہماری مسہری اور سامنے ملک صاحب موجود۔"ارے میاں اٹھ بھی چکو۔ نو بج رہے ہیں اتوار کا دن سہی مگر کیا سوتے ہی رہو گے؟ ذرا جلدی سے منہ پر چھینٹا ڈال لو وہ آیا ہوا ہے ظفر میں نے اس کو بلایا تھا مگر گفتگو تم ہی کرو گے۔"

بجائے کلمہ پڑھنے کے دل ہی دل میں لاحول پڑھتے ہوئے غسل خانے میں پہنچ گئے۔ کتنا میٹھا خواب تھا بلی کو خواب میں ضرورت چھیچھڑے نظر آتے ہوں گے جس طرح مکان کے ضرورت مند کو مکان کے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ملا ملایا مکان ملک صاحب نے چھنوا دیا ایسے خواب پر ہنسی آنا چاہیے مگر ہم کو واقعی دکھ ہو رہا تھا کہ یہ خواب کیوں تھا اور اگر تھا تو نظر کیوں آیا۔

غسل خانے سے نکل کر ملک صاحب کو اپنا منتظر پایا وہ دیکھتے ہی بولے۔

"بات یہ ہے کہ میں اس کو زیادہ منہ لگانا نہیں چاہتا اور نہ تمہاری چچی اس سے بات کرنا چاہتی ہیں طے یہی ہوا کہ تم ہی اس سے گفتگو کرو زیادہ سے زیادہ یہ کہ میں موجود رہوں گا۔"

عرض کیا۔"بہتر ہے یہی سہی۔ مگر وہ ہیں کہاں۔"

ملک صاحب نے فرمایا۔"میں بلواتا ہوں اس کو تمہارے نام سے گویا تم زبردستی مجھ سے ملواؤ گے ورنہ میں تو ملنے کا روادار ہی نہ ہوتا سمجھ گئے نا ......"

اسی وقت غفور چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئے تو ملک صاحب نے فرمایا۔

''دیکھو غفور باہر وہ ہے ظفر اس سے کہہ دو کہ شفقت میاں نے سلام کہا ہے۔''

غفور کو روانہ کرنے کے بعد ملک صاحب گویا پھول سوچ کر بیٹھ رہے اور دروازے کی کھڑ بڑ سے اندازہ ہوا کہ اندر بیگم صاحبہ بھی دروازے کے قریب آ گئی ہیں کہ اتنے میں ظفر کمرے میں داخل ہوئے ہم نے ان کو دیکھتے ہی گرم جوشی سے کہا ''السلام علیکم تشریف لایئے ظفر صاحب ادھر نکل آیئے اس کرسی پر۔''

ظفر نے ملک صاحب کو بھی سلام کیا مگر ان حضرت نے اس طرح منہ دوسری طرف پھیر لیا گویا کہہ رہے ہیں کہ ''نہیں دیتے تیرے سلام کا جواب ہم''

ہم نے کہا ''ظفر صاحب کتنی شکر ڈالوں آپ کی پیالی میں''

ظفر جو اس وقت قدرتی طور پر سٹپٹایا ہوا تھا گھبرا کر بولا ''جی؟ جی نہیں آپ نوش کیجیے۔''

ہم نے دو چمچے ڈال چائے کی پیالی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''بھئی ظفر صاحب میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے اور قبلہ ملک صاحب کو بمشکل اس لئے آمادہ کیا ہے کہ جو ناگوار قسم کی غلط فہمی خواہ مخواہ ایک خلیج بن کر حائل ہو گئی ہے وہ بیچ سے ہٹ جائے آپ نے جس سعادت مندی اور نیک نفسی کے ساتھ اس روز ملک صاحب کی شفقتوں کا ذکر کیا تھا اور جو انفعال خود آپ پر طاری تھا اس کا ذکر میں ملک صاحب سے کر چکا ہوں۔ اب آپ خود ہی ان کھوئی ہوئی شفقتوں کو حاصل کر سکتے ہیں۔''

ظفر تو بھونچکا حیرت سے کبھی ہم کو اور کبھی ملک صاحب کو دیکھ رہا تھا اور ملک صاحب اس وقت میں مبتلا تھے کہ اپنے کو سمیٹ رہے ہیں، نتھنے پھلا رہے ہیں، نگاہیں پھیر رہے ہیں کہ اتنے میں دروازے کی آڑ سے آواز آئی۔

''شفقت میاں تم کو نہیں معلوم کہ میں نے ظفر کو ہمیشہ کیا سمجھا، اس کے کبھی پھانس لگی تو میرا دل تڑپ اٹھا، اس کے لئے رات کو رات اور دن کو دن نہیں سمجھا، مگر اس نے ہم کو جو صلہ دیا ہے اس کو بھی اس کا دل خوب جانتا ہوگا۔''

ملک صاحب نے غالب کا شعر اس طرح پڑھا جیسے خود آپ ہی کا ہو۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیا کسی کا گلہ کرے کوئی

ہم نے کہا۔ ''نہیں صاحب یہ غلط ہے۔ کیا اس وقت ظفر میاں کی یہ خاموشی اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ شرمندگی ان کے لبوں کی مہر بنی ہوئی ہے۔ یہ آپ دونوں کی شفقت سے محروم ہو کر سب کچھ کھو چکے ہیں اور جو کچھ کھویا ہے اب اس کو اپنی سعادت سے حاصل کریں گے۔''

ملک صاحب نے جلبلا کر کہا۔ ''میاں یہ تو وہ مثل ہے کہ مدعی ست گواہ چست، تم ان صاحبزادے کی زبان بنے ہوئے ہو۔ سوال یہ ہے کہ ان حضرت سے پوچھو کہ کیا مجھ کو ان سے یہی امید ہونا چاہئے تھی جو یہ ثابت ہوئے ہیں۔''

ہم نے کہا۔ ''معاف کیجئے گا قبلہ میرے خیال میں یہ طریقہ غلط ہے۔ جو کچھ ہو چکا اگر اس کو آپ چشم پوشی سے کام لے کر ایک مرتبہ بھلا ہی دیں تو شاید یہ شفقت مآب فیاضی ان کو بھی سر نہ اٹھانے دے گی۔''

بیگم صاحبہ کی آواز آئی۔ ''اے بیٹا ہم لوگوں کے لئے ان سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ اگر یہ اب بھی سنبھل جائیں تو میں یہ سمجھوں گی کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا۔''

ملک صاحب نے فرمایا۔ ''تم سمجھو مگر میں یہ نہیں سمجھ سکتا۔ مجھ کو بھی کہاوتیں یاد ہیں اور میں بھی یہ کہہ سکتا ہوں کہ دودھ کا جلا مٹھا پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ میں ان کی طرف سے اس آسانی سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔''

ہم نے کہا۔ "خیر آپ کو مطمئن کرے گا ان کا آئندہ طرزِ عمل۔ ظفر صاحب اب آپ خود ملک صاحب قبلہ کو مطمئن فرمائیے۔"

اُس گاؤدی نے نہایت گدھے پن سے کہا۔ "اب میں کیا کہوں۔ آپ تو کہہ چکے۔"

ہم نے کہا۔ "بے شک اس وقت آپ سے رسمی عہد و پیمان کی امید ہی فضول ہے مگر مجھ کو امید ہے کہ آپ آئندہ کم سے کم اس بات کا خیال رکھیں گے کہ ان بزرگوں کے دلوں کو ان کی بے پناہ شفقت جو حباب کی طرح نازک بنا دیتی ہے۔ اسی حباب کو سنبھالنا ہماری آپ کی سعادت ہے۔"

ملک صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ "آہاہا۔ کیا بات کہی۔ سبحان اللہ۔ دیکھ لیجئے برخوردار یہ ہے وہ گفتگو جس کو...... جس کو...... یعنی جس کو گفتگو کہتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "اچھا اب میری درخواست یہ ہے کہ آپ ظفر میاں کو شفقت سے گلے لگا لیجئے اور اپنے ساتھ اندر لے جائیے۔ میں اس وقت ان کی کیفیت کا اندازہ کر رہا ہوں کہ یہ احساس ندامت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔"

اور ہم نے آنکھ سے ظفر کو بھی اشارہ کیا کہ وہ اٹھیں۔ شکر ہے کہ وہ اس اشارے کو سمجھ کر اٹھے اور ادھر سے ملک صاحب نے بڑھ کر ان کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا تمہارے لئے ہمارے پاس سوائے محبت کے اور ہے ہی کیا۔"

یہ منظر وہ تھا کہ ہماری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ مگر حیرت ہے کہ ظفر پر کسی قسم کا اثر نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ متحیر ضرور تھا۔ اس قسم کے بد باطن لوگ متاثر کبھی نہیں ہوتے ہاں مشکوک ضرور ہو جاتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے کیوں ہے اور اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے کچھ اسی قسم کے شکوک میں مبتلا ظفر صاحب ملک صاحب کے ساتھ گھر میں چلے گئے۔

☆☆☆

ظفر کے آ جانے اور پوری طرح صفائی ہو جانے کے بعد ہم نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی کہ ملک صاحب ہم کو ہنسی خوشی رخصت کر دیں اور اجازت دے دیں کہ ہم کالج سے قریب کسی ہوٹل میں رہیں مگر توبہ کیجئے ان بزرگ محترم نے تو گویا ستیہ گرہ شروع کر دی، ناراض ہو گئے، بچوں کی طرح مچل گئے، عورتوں کی طرح پھول گئے اور لیڈروں کی طرح بھول ہڑتال کی دھمکی دے کر اس وقت تک برت نہیں توڑا جب تک ہم سے کہلوا نہیں لیا کہ ہم اس قسم کا سوال آئندہ کبھی نہ کریں گے بلکہ ایک مرتبہ تو یہاں تک ہوا کہ ہم نے کالج کے ذمہ داروں کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ ہم کو کالج کے ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ بنا دیں اور جب یہ طے ہو گیا تو سچ مچ ان بڑے میاں نے زمین آسمان ایک کر دیا، ناشتہ چھوڑ دیا، کھانا چھوڑ دیا، ایک ایک کو کاٹنے کو دوڑنے لگے، یہاں تک کہ بیگم صاحبہ نے گویا اپنے سہاگ کی ہم سے بھیک مانگی اور ہم کو آخر کار یہ لاجواب موقع بھی ہاتھ سے چھوڑنا پڑے اور یہ طے کر لیا کہ اب خواہ کچھ بھی ہو رہنا یہیں پڑے گا۔

مگر مصیبت یہ تھی کہ ظفر صاحب کا اب ہر وقت کا ساتھ تھا، ان کو ہمارے مقابل کا دوسرا کمرہ مل گیا تھا اور وہ حضرت ایک مستقل مصیبت بنے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ رہنے اور چوبیس گھنٹے سابقہ پڑنے کے بعد اندازہ ہوا کہ واقعی ملک صاحب کتنے عالی ظرف انسان تھے جو اس گدھے سے نباہ کر رہے تھے بلکہ اپنی قابل رحم بیٹی تک کو اس نامعقول کے

ساتھ نباہ کرنے کے منصوبے باندھے ہوئے تھے۔ صاحب اس مرتبہ کا چغد تو نہ دیکھا نہ سنا۔ جاہل تو وہ خیر تھا ہی ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ درجہ کا بدتمیز اور نہایت گھٹیا انسان بھی تھا۔ عجیب عجیب شوق تھے۔ ہمارے ممدوح کو مثلاً پہلوانی کا شوق برا نہیں ہے یہ شوق بشرطیکہ اس کا تعلق صرف صحت ٹھیک رکھنے، جسم کو بنانے اور ورزش کی حد تک ہو مگر وہاں اس پردے میں بھی غنڈہ پن موجود تھا جو ان حضرت کی فطرت بن چکا تھا۔ پھر ذرا تضاد ملاحظہ ہو آپ خیر سے شاعر بھی تھے جی ہاں شاعر بلبل تخلص فرماتے تھے۔ اس تخلص ہی سے خوش مذاقی ظاہر ہے۔ آج تک کسی بڑے سے بڑے چڑی مار نے بھی یہ بے ہودہ تخلص نہ رکھا ہوگا۔ خیر ہماری بلا سے وہ شاعر ہوتے یا نہ ہوتے ہم سے کیا مطلب مگر مصیبت تو یہی ہے کہ مطلب تھا اور مطلب رکھنا پڑتا تھا جب دیکھئے تشریف لا رہے ہیں ایک پرچہ ہاتھ میں لئے ہوئے کہ ''بھائی ان رات کو ایک غزل ہوگئی ہے ذرا پھڑکتی ہوئی۔ بات یہ ہے کہ میں کل سنیما چلا گیا تھا وہاں ایک غزل سنی۔

نظر کچھ آج ایسا آرہا ہے

بس اسی پر کچھ شعر ہوگئے ہیں۔''

اب یا تو وہ غزل سنئے جس کو سن کر خوش مذاق کا خون ہو ورنہ ظاہر ہے کہ وہ پہلوان بھی ہیں اور دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں باندھا جاسکتا۔ مجبوراً منافقت سے کام لے کر بڑا اشتیاق ظاہر کرنا پڑتا ہے اس غزل کو سننے کا، جو خدا کسی خوش مذاق دشمن کو بھی نہ سنوائے، بہرحال عرض کرنا پڑتا ہے کہ ''خوب خوب۔ تو گویا اسی بہانے غزل ہوگئی۔ بھئی ضرور سنائیے۔''

ظفر صاحب نہایت شاعرانہ ٹھسے کے ساتھ نہایت بازاری ترنم سے شروع ہوگئے۔

''عرض کیا ہے۔ مطلع کہتا ہوں۔

جو آنچل اس کا ڈھلکا جارہا ہے
تو وہ کافر حسیں شرما رہا ہے

اب عالم یہ ہے کہ ساعت کو متلی آ رہی ہے۔ دل کہہ رہا ہے کہ لاحول ولاقوۃ اور ہم کہہ رہے ہیں۔ ''بھئی سبحان اللہ کیا زبان ہے کیا بیان ہے کیا روزمرہ ہے۔''

کہنے لگے۔ ''جی ہاں اور لوگوں نے بھی اس کو بہت پسند کیا ہے بلکہ ایک قوّال تو مچل گیا تھا کہ مجھ کو گانے کے لئے دے دیجئے یہ غزل، میں نے کہا کہ پہلے آپ کی رائے لے لوں۔ دوسرا شعر کہتا ہوں۔

وہ غیروں کو گلوری پر گلوری
ہمیں یوں بھی جلایا جارہا ہے

اس شعر کو سن کر تو صدق دل سے ملک صاحب کی صاحبزادی پر فاتحہ پڑھنا پڑی اور عجیب عبرت سے وہ تمام بیہودہ غزل سنتے رہے جس کا مقطع یہ تھا کہ۔

مجھے بلبل بنایا آپ کو گل
عجب یہ گل کھلایا جارہا ہے

ہمدردی کیجئے ہم سے کہ نہ صرف ہم مجبور تھے یہ غزل سننے کے لئے بلکہ سینہ پر پتھر رکھ کر ان اشعار کی داد بھی دینے کے لئے مجبور تھے اور صرف یہی اشعار کیا ہر وقت کسی نہ کسی بد مذاقی کو سراہنا پڑتا تھا۔ سراہنا نہ بھی پڑے تو بھی یہ منظر ذوق نظر کے لئے کس قدر تکلیف دہ تھا کہ یہ پہلوان صاحب سر منڈائے سر پر چنبیلی کا تیل چپڑے منہ کو پانوں کی کثرت سے اگالدان بنائے، پھول دار چکن کا کرتہ پہنے کانوں میں عطر کی روئی لگائے، کبھی تہبند باندھے اور کبھی شلوار پہنے جھومتے چلے آرہے ہیں، نہ پڑھنے دیتے ہیں نہ لکھنے دیتے ہیں کبھی شعر سنا کر دماغ کا ناس کررہے ہیں، کبھی اپنے بازاری معاشقوں کی لغو اور شرمناک داستانیں

سنا کرناک میں دم کیے ہوئے ہیں۔ کوشش یہ بھی ہے کہ بے تکلف ہو جائیں۔ دعوت اس کی بھی ہے کہ ہم اس کے ساتھ تاش کھیلیں۔ ان کے ایک سے ایک لوفر دوست سے دوستی بگھاریں۔ ان کے ساتھ کسی عظیم الشان دنگل میں جائیں۔ کسی آل پاکستان مشاعرہ چونا منڈی میں شرکت کریں اگر کچھ نہیں تو اس میں تو گویا کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ان کے بے تکلف دوستوں میں بیٹھ کر اس خوش مذاقی میں حصہ لیں جس میں ابے تبے اور گالم گلوچ کو خلوص کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ پھر سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ ملک صاحب نے ان حضرات کو مشورہ دیا تھا کہ اگر آدمی بننا چاہتے ہو تو شفقت میاں کی صحبت میں بیٹھا کرو، چنانچہ وہ حضرت ملک صاحب کے مشورے کے مطابق اس بے خانماں کے لئے عذاب بنے ہوئے تھے۔ حد یہ ہے کہ جس دن سے یہ حضرت تشریف لائے تھے قسم کھانے کو نہ کچھ پڑھ سکتے تھے نہ کچھ لکھنے کی نوبت آئی تھی۔ وہ ڈائری جو ہم نہایت بے ساختہ عادت کے طور پر روزانہ لکھا کرتے تھے اب ناغہ ہونے لگی تھی کہ آج کی ڈائری کل لکھ رہے ہیں۔ جتنا لکھنا چاہتے ہیں، اس سے مختصر لکھ رہے ہیں، جب رات کو تمام دنیا سو رہی ہے ہم چوری سے بیٹھے لکھ رہے ہیں۔ اب آج ہی رات کو بارہ بجے جب ساری دنیا سو گئی اور ہم لکھنے بیٹھے اپنی ڈائری کو آج کی تاریخ لکھ ڈالیں تو اطمینان سے سوئیں کہ ایک دم سے چق اٹھا کر بولے:۔

''اخاہ، اس وقت بھی کچھ لکھا جا رہا ہے کمال کرتے ہیں آپ بھی، میں ابھی خلیفہ تاج دین اور چوہدری اللہ دتا کو رخصت کر کے جو لوٹا تو دیکھا کہ آپ کے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ یہ لکھا جا رہا ہے۔''

عرض کیا۔ '' کچھ نہیں یوں ہی ایک یادداشت لکھ رہا تھا۔''

کہنے لگے۔ ''اجی اس سے تو کوئی ناول لکھئے آپ، میرا بھی ارادہ ہو رہا ہے کہ ایک

ناول لکھنے کا، نام میں نے طے کر لیا ہے۔ ''تیر نظر'' کیا رائے ہے آپ کی۔''

جی تو چاہا کہ ڈائری ان حضرت کے منہ پر کھینچ ماریں مگر انسان وہ کر نہیں سکتا جو چاہتا ہے اور جو اس کو کرنا پڑتا ہے وہی اس وقت ہم نے بھی کیا کہ ان کے ناول ''تیر نظر'' کے متعلق نہایت صبر و سکون سے رائے دینے بیٹھ گئے۔ ''نام تو بڑا ابا نکا ہے.....''

وہ بدتمیز بات کاٹ کر بولا۔ ''ایک اور بھی بڑا بے ڈھب نام سمجھ میں آیا ہے۔ ''چنچل دل'' میرے خیال میں اس پر آپ لکھ ڈالئے۔''

لیجئے گویا یہ بھی مصرعہ طرح ہے کہ اس پر لکھ ڈالئے مگر اس ناجنس کو ہم یا سمجھاتے کہ ناول کے نام پر ناول تم ہی لکھ سکتے ہو پھر نام بھی ''چنچل دل'' مگر دل ہی دل میں کھول کر رہ گئے اور کہا تو صرف یہ کہا۔ ''ابھی مجھے کہاں سلیقہ ناول لکھنے کا۔''

لیجئے وہ بڑے عبدالحلیم شرر بن کر بولے۔ ''سلیقے کی بات نہیں، وہ تو میں آپ کو بتا دوں گا کہ اس میں کیا لکھیں کوئی مشکل کام تھوڑی ہے ناول لکھنا، میں آپ کو دکھاؤں گا اپنا ناول جو میں لکھ چکا ہوں۔ اس کا نام میں نے بڑا لاجواب رکھا ہے دل کا سودا عرف مول تول اور قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک شہزادہ ہے جو ایک تیلی کی لڑکی پر عاشق ہو گیا ہے، لڑکی ہے بھی چندے آفتاب چندے ماہتاب بانکی، رسیلی، چھبیلی مگر شہزادے کے ہاتھ نہیں آتی اور اس کے باپ کی شرط یہی ہے کہ میری لڑکی کا بر اگر ہو سکتا ہے تو تیلی ہو سکتا ہے ادھر بادشاہ سلامت کو شہزادے کے عشق کی خبر ہوتی ہے تو وہ حکم دے دیتے ہیں کہ شہزادے کو قید کر دیا جائے، اس لئے کہ بادشاہ کی بہو اور سلطنت کی ہونے والی ملکہ تیلی لڑکی نہیں ہو سکتی ہے۔ اب شہزادہ قید خانے میں ہے ادھر تیلی کی لڑکی جان سے جا رہی ہے آخر کرنا خدا یہ ہوتا ہے کہ بادشاہ سلامت کو سانپ ڈس لیتا ہے اور شہزادہ قید خانے سے نکل کر تخت شاہی پر لایا جاتا ہے مگر شہزادہ اسی دن غائب ہو جاتا ہے اور آخر ایک دوسرے شہر سے تیلی بن کر آتا ہے۔

اور اس تیلی کی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے مگر پھر تخت حکومت تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں آپ کو سناؤں گا پورا ناول۔

جب یہ حضرت رات کے دو بجے کے قریب دماغ میں بل چلا کر تشریف لے گئے تو اپنی بے بسی پر رونے کو جی چاہتا تھا اور دماغ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ الٰہی اس طرح کیونکہ زندگی بسر ہوگی۔

☆☆☆

غفور میاں پہلے تو کچھ دن سخت ناراض رہے مگر جس طرح نالائق اولاد کو بھی والدین چھوڑ نہیں سکتے اسی طرح اب وہ ہم سے وابستہ تو تھے مگر کچھ کھنچے کھنچے سے ان کی نگاہوں سے شکایتیں برستی تھیں مگر زبان سے کچھ کہہ نہ سکتے تھے، جانتے تھے کہ ہم قابل رحم حد تک بے وقوف ہیں جو ان کے مشوروں پر نہ چلے، ظفر ایسے آستین کے سانپ کو اپنے قریب بلا لیا، ملک صاحب سے اس کی صفائی کرادی اور اس گھر پر پھر وہی عذاب نازل کرادیا جس سے خدا خدا کر کے گھر والوں کو نجات حاصل ہوئی تھی۔ یہ شکایت کچھ ایسی ویسی نہ تھی کہ غفور میاں آسانی سے اس کو بھلا دیتے اور ہم کو معاف کر دیتے مگر بے چارے اپنی بزرگانہ شفقت سے مجبور تھے کہ ہماری اس عاقبت نااندیشانہ بیہودگی کے باوجود ہمارا خیال رکھتے تھے۔ آخر ایک دن ہم نے ان کی نگاہوں کی شکایت کی تاب نہ لا کر تخلیے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے کہا:۔

''بھئی غفور تم مجھ سے بہت خفا معلوم ہوتے ہو۔''

غفور غالباً اسی وقت کے منتظر تھے، کمرے کی جھاڑ پونچھ ملتوی کر کے جھاڑن کندھے پر ڈالتے ہوئے بولے۔ ''ارے صاحب ہم کیا اور ہماری خفگی کیا خادم ہیں آپ کے، مالکوں سے کس کی مجال ہے کہ خفا ہو۔''

ہم نے کہا ''چونکہ تمہاری اس خفگی میں بلا کا خلوص ہے اس لئے میں نہیں چاہتا کہ تم کو اپنے سے خفا رہنے دوں۔''

غفور نے قریب آ کر پہلے تو ادھر ادھر دیکھا پھر ذرا دھیمی آواز میں کہا" خدا نہ کرے کہ حضور کو اس بڈھے کی بات کی سچائی کا اندازہ کرنا پڑے مگر آپ نے جس سنپولئے کو پالا ہے وہی آپ پر پھن اٹھائے گا۔"

ہم نے غفور کو سمجھاتے ہوئے کہا" دیکھو نا غفور میاں پھن تو وہ جب اٹھائے اگر میں اس کے راستے میں آؤں جب میرے اور اس کے حقوق ہی علیحدہ علیحدہ ہیں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

غفور نے بڑے تاثر سے کہا۔" سال بھر کی تھیں غزالہ بی بی جب میں اس ڈیوڑھی پر آیا ہوں میں نے ان کو گودوں میں کھلایا ہے۔ ان سے اپنی ڈاڑھی نچوائی ہے، دن بھر میرے ساتھ رہتی تھیں اور آج تک مجھ سے پردہ نہیں ہے بابا کہتی ہیں مجھ کو میں آپ سے سچ کہتا ہوں لاکھ دو لاکھ میں ایک ہی بچی ہے میری آنکھوں میں خاک کھلا ہوا گلاب کا پھول، بے زبان، ہنس مکھ، اس گھر کا کارخانہ اسی کے دم سے چل رہا ہے۔ ہیرا ہے ہیرا اور اس ہیرے کو اس پتھر سے توڑا جا رہا ہے اور کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو مگر میں جانتا ہوں جتنے دن یہ صاحبزادے اس گھر سے باہر رہے میری غزالہ بی بی خوش بھی رہیں چاق و چوبند بھی رہیں اور جس دن سے یہ پھر آ گئے ہیں اس بے چاری کو ایک چپ سی لگ گئی ہے، منہ سے کچھ کہہ نہیں سکتی دل ہی دل میں کڑھا کرتی ہے۔"

ہم نے سب کچھ سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر کہا۔" مگر اس کی وجہ کیا ہے، آخر کون سا عیب ہے ظفر میاں میں۔"

غفور نے ایک دم مشتعل ہوتے ہوئے کہا" کون سا عیب ہے؟ اے حضور یہ پوچھئے کہ کون سا عیب نہیں ہے، پڑھے نہ لکھے، لٹھ کے لٹھ، لقوں لفنگوں کی صحبت، حرام چیز تک منہ کو لگی ہوئی ہے۔ کون سا شہدہ پن ہے جو ان صاحبزادے نے اٹھا رکھا ہو۔ اس گھر میں کوئی کالے

سر والی انا، آیا، خادمہ ان کی وجہ سے نوکر نہیں رکھی جا سکتی پاس پڑوس کی بہو بیٹیوں کو اس درندے سے اس طرح چھپایا جاتا ہے جیسے سچ مچ کوئی بھیڑیا لاگو ہو گیا ہو جو دوست ہیں ان کے ان کا حال آپ دیکھ ہی رہے ہیں، وہ تو کہیئے بھورے خاں آج کل جیل میں ہیں ورنہ وہ تھے ان کے وزیر اعظم۔"

ہم نے حیرت سے پوچھا۔ "بھورے خاں؟ وہ کون بزرگ تھے۔"

غفور نے کہا۔ "وہ کسی طوائف کا بھائی تھا ان صاحب کو طبلہ سکھانے آیا کرتا تھا پھر ان کا مصاحب بن گیا اسی نے تو ان کا یہ ناس مارا ہے اور غزالہ بی بی کو ان سب باتوں کی رتی رتی خبر ہے۔"

ہم نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ شادی ہو جائے گی تو ظفر میاں ٹھیک ہو جائیں گے۔"

غفور نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "توبہ کیجئے سرکار وہ ٹھیک ہوں یا نہ ہوں مگر یہ معصوم بچی تو گھل گھل کر ختم ہو جائے گی اس کو تو جیسے نفرت ہے ان صاحبزادے سے نام آیا اور پھول سا چہرہ مرجھایا، سامنے آئے یہ اور رنگ زرد ہوا۔ کل کا قصہ سناؤں آپ کو اون کا گچھا اور تیلیاں لئے کچھ بن رہی تھیں میں نے پوچھا کیا ہے، بی بی کہنے لگیں سوئیٹر ہے بابا، میں نے پوچھا آپ کا ہے کہنے لگیں مردانہ ہے میں سمجھا ظفر کے لئے بن رہی ہیں اور میرے انداز سے تاڑ گئیں کہ میں کیا سمجھا ہوں جھٹ کہنے لگیں شفقت صاحب کے لئے بن رہی ہوں بابا۔"

ہم نے چونکتے ہوئے کہا۔ "کیا کہا؟ میرے لئے؟ یعنی میرے لئے سوئیٹر بن رہی ہیں۔"

غفور نے کہا۔ "یہی تو رونا ہے کہ کیسا اچھا جوگ ہو سکتا ہے یہ اور آپ ہیں کہ گھیر گھیر کر اس کانٹے کو اپنے راستے میں لاتے ہیں جو یہاں سب کی آنکھوں میں کھٹک رہا ہے۔"

اب ہم غفور سے کیونکر کہہ دیتے کہ ہم ''برائے فروخت'' نہیں ہیں بلکہ مدت ہوئی ہے بک چکے ہیں اور غفور تھے کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر کہتے چلے جا رہے تھے۔ ''سرکار ان کا تو حال یہ ہے کہ آپ ادھر باہر گئے اور وہ آپ کے کمرے میں آگئیں۔ اس کمرے کی صفائی اور آپ کی چیزوں کو ٹھیک سے رکھنا یہ ان کا سب سے پیارا کام ہے۔ ایک ایک کپڑا دیکھتی ہیں کہ کس قمیض میں بٹن نہیں ہیں، کس پتلون پر استری نہیں ہے۔ یہ جو آپ کو اپنی ہر چیز سلیقے سے ٹھیک ٹھاک ملتی ہے کیا آپ اس کو میرا کام سمجھتے ہیں۔''

اور ہم واقعی اس کو غفور ہی کا کام سمجھتے تھے مگر غفور کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ غلط فہمی جڑیں پکڑتی جا رہی ہے اور بیچاری غزالہ اپنے تصور میں ایک ایسی دنیا بسائے بیٹھی ہے۔ جو کبھی واقعاتی دنیا نہیں بن سکتی۔ ضرورت اس کی ہے کہ جلد سے جلد اس غلط فہمی کو دور کیا جائے مگر اس کی کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آتی تھی۔ جھوٹ بول چکنے کے بعد اب یہ آسان نہ تھا کہ ایک دم سچ بول دیا جائے اور ملک صاحب کو بتا دیا جائے کہ ہم شادی شدہ بھی ہیں اور صاحب اولاد بھی اور نہیں بتاتے ہیں تو یہ غلط فہمی استوار ہوتی جاتی ہے۔ ہم اس شش و پنج میں مبتلا تھے اور غفور اپنی خوش فہمی کے ماتحت یہ سمجھ رہے تھے کہ گویا ہم متاثر ہو رہے ہیں کہنے لگے ان سفید بالوں کی قسم سرکار غزالہ بی بی اس وقت موت اور زندگی کی پگڈنڈی پر چل رہی ہیں موت ہیں ان کے لئے ظفر میاں اور زندگی آپ دے سکتے ہیں یہ میرا خیال نہیں بلکہ یہ غزالہ بی بی کے وہ الفاظ ہیں جو ایک لڑکی زبان سے کہہ بھی نہیں سکتی۔''

ہم نے چونک کر کہا۔ ''تو غزالہ نے یہ تم سے کہا ہے۔''

غفور نے دانتوں میں انگلی دبا کر کہا۔ ''توبہ کیجئے وہ بھلا کہیں گی مگر ان کی نگاہیں یہی کہتی ہیں۔''

ہم غفور کے اس شعر کی داد دینے ہی والے تھے کہ ظفر نے داخل ہو کر یہ راز و نیاز ختم

کر دیا۔ اور غفور بھی اس کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا ہوا کندھے پر جھاڑن سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا۔ ظفر صاحب حسب معمول اپنے ساتھ بہت سے اختلاج آور نسخے لے کر آئے تھے۔ غفور کے جانے کے بعد کرسی ہمارے قریب کھسکا کر بڑے رازدارانہ انداز میں بولے۔ ''بھائی صاحب آج ایک بات آپ سے عرض کرنا تھی۔ بات یہ ہے کہ یہ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ جوانی جو ہوتی ہے اس کو دیوانی کہا جاتا ہے، بڑا بیہودہ زمانہ ہوتا ہے یہ، آدمی ہر طرف بہک سکتا ہے اور دل پر ذرا مشکل ہی سے قابو رہتا ہے انسان کو اور آپ کی قسم میں اب یہ بالکل نہیں چاہتا کہ کسی طرف بہکوں ایسی صورت میں آپ ہمارے قبلہ وکعبہ کو یہ مشورہ کیوں نہیں دیتے کہ بھئی اگر شادی کرنا ہی ہے تو اس نیک کام میں دیر کی کیا ضرورت ہے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ تو طے ہی کر چکے ہیں کہ مجھ کو غلامی میں لیں گے۔ پھر آخر انتظار کس بات کا ہے۔ جوان لڑکی گھر میں بٹھائے رکھنے سے فائدہ ہی کیا ہے اور مجھ کو آخر کب تک آزمائیں گے بلکہ آپ ان سے میری طرف سے کہہ دیجئے گا کہ

''اب اور کیا چاہتا ہے ظالم تیرے اشاروں پہ چل رہے ہیں''

گھر کی گھر ہی میں شادی ہونا ہے نہ جہیز کی فکر ہے نہ کہیں لڑکی کو بھیجنا ہے۔ پھر آخر دیر کیوں کی جا رہی ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''سوال یہ ہے کہ جب آپ کو خود معلوم ہے کہ یہ بات ہو کر رہے گی تو پھر کیا یہ مناسب ہوگا کہ آپ کی طرف سے تقاضا کیا جائے۔''

ظفر نے کہا۔ ''بھیا سچی بات یہ ہے کہ شادی کے بعد شیطان پھر اس طرح نہ گھیرے گا جس طرح اب گھیرا کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ ہو چکا ہے بہت ہوا مگر اب آدمیت کے ساتھ رہوں۔''

ہم نے غفور کی گفتگو اور اس گفتگو کی روشنی میں فی الحال ایک نتیجہ نکالا کہ واقعی ملک

صاحب پر زور ڈالنا چاہئے کہ وہ شادی میں دیر نہ کریں ہر چند کہ یہ غزالہ پر ظلم تھا مگر اس سے بڑا ظلم یہ تھا کہ وہ اس غلط فہمی کا مستقل طور پر شکار رہے جس میں وہ مبتلا تھے اور جو کبھی نتیجہ خیز نہ ہو سکتی تھی۔ ظفر سے تو ہم نے وعدہ کر لیا کہ سفارش ضرور کی جائے گی مگر خود مستقل طور پر اسی ادھیڑ بن میں رہے کہ گتھی کو کیونکر سلجھائیں۔

☆☆☆

ابھی ہم آج کی ڈائری کی آخری سطریں لکھ ہی رہے تھے کہ ملک صاحب قبلہ کا ماہی مراتب یعنی حقہ لے کر میاں غفور داخل ہوئے ملک صاحب جب ذرا تفصیل سے ہمارے پاس بیٹھنے آیا کرتے ہیں تو پہلے ان کا حقہ آتا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم حقہ دیکھ کر سمجھ گئے کہ ذرا جماؤ کی محفل ہوگی۔ ملک صاحب نے آتے ہی السلام علیکم کا نعرہ بلند کیا اور قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ کر پہلے حقہ کا زاویہ درست کیا پھر اس کے پانی اور آواز کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد بولے۔

’’کہیے مولانا کیا ہو رہا تھا، وہی لکھنا پڑھنا ہو رہا ہوگا، کتابوں کے تو تم کیڑے ہو۔ میاں کبھی کمرے سے نکل کر باغ میں ٹہلا وہلا بھی کرو۔ کبھی سنیما چلے جایا کرو، کبھی دوست احباب کو ذرا بلا لیا، تم تو عجیب آدمی ہو، کالج میں دن بھر سر کھپانا پھر گھر آ کر یہ دماغ سوزی۔‘‘

عرض کیا۔ ’’کالج میں اس قسم کی تفریحیں آئے دن ہوتی ہی رہتی ہیں۔ رہ گیا، فرصت کا وقت اس کو انسان اسی مشغلہ میں صرف کرتا ہے جو اسکی سب سے زیادہ عزیز ہو اور میرا عزیز ترین مشغلہ یہی لکھنا پڑھنا ہے۔

کہنے لگے۔ ’’اچھا بابا لکھو خوب اور پڑھو خوب، میں تو اس وقت اس خیال سے آیا تھا کہ تم سے ذرا مشورہ کروں گا کچھ، بات یہ ہے کہ تم کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ میرے کوئی اولاد نرینہ نہیں لے دے کر ایک بچی ہے خدا اس کی عمر میں برکت دے۔ سوچا یہ تھا کہ ظفر ڈھنگ کا

نکل آئے گا تو سب کچھ اسی کے حوالے کر کے یاد اللہ میں کچھ دن بسر کریں گے، مگر وہ سب کچھ نہیں ہو سکتا جو انسان چاہتا ہے۔ مقدر سے وہ بھی ایسے نکلے ہیں جیسے نظر آ رہے ہیں۔"

دروازے کے پیچھے سے آواز آئی، توبہ ہے تم سے بھی اب تو طلسم ہوشربا سنانے بیٹھ گئے مطلب کی بات کیوں نہیں کہتے۔"

بیگم صاحبہ کی آواز سن کر ہم نے سلام کر کے دعائیں وصول کیں۔ تو ملک صاحب نے فرمایا۔

"بھائی قصہ اصل میں یہ ہے کہ بیگم صاحبہ مسلسل حج کا ارادہ کر رہی ہیں اور تین چار روز سے تو ہر وقت یہی ذکر ہے۔ آخر میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں شفقت کے سامنے یہ قصہ رکھے دیتا ہوں جو اس کا فیصلہ ہوگا وہی ٹھیک ہے اور اسی پر عمل کریں گے۔"

بیگم صاحبہ نے اندر ہی سے فرمایا۔ "میاں میری سنو، بھیا زندگی کا کیا اعتبار، آج مرے کل دوسرا دن، عمر بھر کی ایک تمنا بس یہی تھی کہ یہ فرض بھی پورا ہو جاتا اور حضور کی خدمت میں حاضری کا موقع بھی مل جاتا، تو میاں اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ تم موجود ہو اور تم سے بڑھ کر ہم لوگوں کو اور کس پر اعتبار ہو سکتا ہے۔"

ہم نے کہا۔ "درست ہے نہایت مبارک ارادہ ہے اور میں ہر طرح حاضر ہوں مگر ایک شرعی صورت آپ کی خدمت میں پیش کر دوں کہ جب تک آپ غزالہ کی شادی کے فرض سے سبکدوش نہ ہو جائیں حج کی شرائط پوری نہیں کر سکتیں۔"

ملک صاحب نے گویا ایک دم یاد کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے یہ میں نے بھی کہیں پڑھا ہے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا۔ "اے بیٹا تو اس شرط کے پورا ہونے کا کب تک انتظار کر سکتی ہوں۔ غزالہ کو تو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی......"

ہم نے کہا۔ ''درست ہے مگر اس طرح یہ شرط پوری نہیں ہوتی البتہ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں عرض کروں کہ آخر آپ پہلے اس فرض سے سبکدوش کیوں نہیں ہو جاتیں۔''

بیگم صاحبہ نے کہا۔ ''اے میاں کیسے ہو جاؤں سبکدوش جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتے ہو تم تو۔''

ملک صاحب نے کہا۔ ''پہلے سن تو لو کہ ان کی تجویز کیا ہے، ہاں تو مولانا کیسے ہو جائیں سبکدوش؟''

ہم نے کہا۔ ''صاحب لڑکا گھر میں موجود ہے۔ اللہ کا نام لے کر پڑھا دیجئے دو بول اب آپ کہیں گے لڑکے کے اطوار پر آپ کو بھروسہ نہیں ہے مگر میرا خیال ہے کہ ظفر میاں کی اصل اصلاح نہ آپ کر سکیں گے نہ میں یہ اصلاح صرف بیوی کر سکتی ہے آپ کو کیا معلوم کہ غزالہ بی بی کی قسمت میں کیا لکھا ہے خدا پر بھی کچھ باتیں چھوڑنا چاہئیں۔''

بیگم صاحبہ بولیں۔ ''جیتے رہو میاں، یہی میں بھی ان سے کہتی ہوں اور دن رات سمجھاتی ہوں مگر کسی طرح ان کے دماغ میں یہ بات آتی ہی نہیں۔''

ملک صاحب نے فرمایا۔ ''اور نہ آ سکتی ہے ایسی اوندھی بات میرے دماغ میں، صاحب میں ان صاحبزادے کے طور طریقے دن رات دیکھ رہا ہوں ایک سے ایک اُلو کا پٹھہ ان کو دن رات گھیرے رہتا ہے لاکھ چاہتا ہوں کہ یہ آدمیت کے جامے میں آ جائیں مگر کتے کی دم جب نلکی سے نکال کر دیکھتا ہوں ٹیڑھی کی ٹیڑھی ملتی ہے۔ کل ہی میں نے دیکھا کہ ایک لفنگے کے ساتھ لنگوٹ باندھے کشتی لڑ رہے ہیں۔

ہم نے کہا۔ ''تو کون سی بری بات ہے۔ شادی کے بعد ان کو ان فضول باتوں کی فرصت ہی نہ ملے گی اور میں تو اس کا قائل ہوں کہ یا تو آپ ظفر میاں کا خیال ہی دل سے نکال دیں یا ان کی اصلاح کی صورت یہ تجویز کریں کہ شادی کے بعد وہ خود ہی سنبھل جائیں گے۔

ملک صاحب نے کہا۔ ''اور اگر نہ سنبھلے تو؟''

بیگم صاحبہ نے کہا۔ ''یہ تو غزالہ کا مقدر، تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ قسمت والی ہے تو اسی کو ٹھیک کر لے گی نہیں تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

ملک صاحب نے کہا۔ ''وہی مثل ہے کہ

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

بیگم صاحبہ نے کہا۔ ''اب یہ تمہاری دھاندلی ہے کہ اندر سے یہ کہہ کر آئے تھے کہ جو کچھ شفقت میاں طے کر دیں گے وہ مجھ کو منظور ہوگا اور اب کہہ رہے ہیں طبیعت ادھر نہیں آتی۔''

ملک صاحب نے کہا۔ ''تو گویا آپ کا خیال یہ ہے کہ میں ان ہی حضرت کے ہاتھ میں بغیر کچھ سوچے سمجھے غزالہ کا ہاتھ دے دوں۔''

ہم نے کہا۔ ''بغیر کچھ سوچے سمجھے اگر آپ ان کو اسی خیال سے اپنے یہاں رکھے ہوئے ہیں اور ان کو معلوم ہے کہ آپ ان کو اپنا داماد بنانے والے ہیں بلکہ تمام دنیا کو یہ بات معلوم ہے تو اب سوچنے سمجھنے کا کیا سوال، اللہ کا نام لے کر کر دیجئے شادی۔''

ملک صاحب نے فرمایا۔ ''ممکن ہے کہ میری ہی بوڑھی عقل میں یہ بات نہ آ رہی ہو مگر قیامت کے دن غزالہ میرا گریبان تو نہ پکڑے گی کہ مجھ بے زبان کے ساتھ آپ نے یہ کیا سلوک کیا۔''

ہم نے کہا۔ ''میں نے غزالہ کو دیکھا نہیں، اس سے کبھی بات نہیں کی مگر اس کے باوجود مجھے اس پر اتنا اعتماد ضرور ہے کہ وہ اپنی قسمت کا ذمہ دار آپ کو نہیں ٹھہرا سکتی۔ دوسرے میرے خیال میں اس میں اتنی صلاحیت ضرور ہے کہ وہ ان ہی ظفر میاں کو جن کی طرف سے آپ اس قدر مایوس ہیں اپنے سلیقے اور اپنے اثر سے ایسا سیدھا کرے گی کہ آپ بھی دیکھیں۔''

بیگم صاحبہ نے کہا۔ ''میں خود ان سے یہی کہتی ہوں مگر ان کی سمجھ میں تو ہمیشہ کا پھیر ہے عقل کی بات تو سمجھ ہی میں نہیں آتی۔

ملک صاحب نے کہا۔ ''صاحب میں ظفر کے عادات و اطوار کی اصلاح کا قائل ہوسکتا ہوں مگر اس کی فطرت میں جو گراوٹ ہے اور اس کی ذہنیت میں جو گھٹیا پن ہے اس کی اصلاح دنیا کی کوئی طاقت نہیں کرسکتی۔''

بات ملک صاحب نے بالکل ٹھیک کہی تھی مگر ہم کیسے کہہ دیتے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہم نے کہا۔ ''تو پھر اس خیال ہی کو چھوڑ دیجئے میری تو سمجھ میں آتا نہیں کہ آپ نے داماد کے لئے معیار کیا قائم کر رکھا ہے۔''

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ ''معیار؟ معیار معلوم کرنا چاہتے ہو، بتادوں میں تم کو اپنا معیار، میرا معیار یہ ہے کہ میں غزالہ کے لئے شفقت ایسا دولہا چاہتا ہوں۔ ڈھونڈ تو دو مجھ کو کوئی اپنا سا۔''

بیگم صاحبہ نے ہنس کر کہا۔ ''بس دن رات یہی رٹ ہے وہی مثل کہ
''مجھ کو تو تُو پسند ہے اپنی نظر کو کیا کروں''

ہم تھوڑی دیر تک تو سناٹے میں رہے اس کے بعد کہا، کاش ایسا ہوسکتا۔ مگر غزالہ میری بہن ہے اور میری رائے یہی ہے کہ آپ یا تو ظفر پر نہیں بلکہ غزالہ کی قسمت پر اعتماد کریں۔ ورنہ اس خیال کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں۔''

ہم نے دیکھا کہ ہمارے جواب پر ملک صاحب سناٹے میں آگئے اور آخر بجھی ہوئی آواز میں بیگم صاحبہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ''اگر ظفر ہی کے ساتھ اس کا جوڑا لکھا جاچکا ہے تو ہم تم کچھ نہیں کرسکتے۔ کرو شادی کی تیاری اور مقرر کرو تاریخ......''

☆☆☆

آج رات کو ہر طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد ڈائری لکھنے کے لئے ہم نے جو ڈائری کو کھولا ہے تو قلم ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ جہاں تک ڈائری لکھ چکے تھے اس کے آگے نہایت خوب صورت زنانہ خط لکھا ہوا تھا۔

''آج مجھ کو اپنی ڈائری میں خود غزالہ کی ایک تحریر ملی جس نے ان الفاظ کے ساتھ میری ڈائری کو پورا کیا تھا کہ آپ کو اس بات کا پورا حق تھا کہ آپ میرے والد کی سادہ لوحی سے مستقل طور پر کھیلتے رہتے میری والدہ کی نیک نفسی کو اپنا کھلونا بنائے رکھتے۔ مگر اس کا حق آپ کو یقیناً نہ پہنچتا تھا کہ ایک لڑکی کے تصورات میں آ کر پہلے اس پر فاتحانہ قبضہ کرتے اور پھر اسے اس کی جیتی جاگتی موت کے سپرد کر دینے کا مشورہ دے کر خود دامن بچا جاتے، مجھ کو اب تک معلوم نہ تھا کہ آپ کون ہیں، کیا ہیں اور میں کیوں خواہ مخواہ آپ کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگی ہوں، مگر کل آپ نے میرے والدین کو جو مشورہ دیا ہے اس نے پہلے تو مجھ کو ششدر کر دیا اور اب جبکہ اتفاق سے آپ کی یہ ڈائری میری نظر سے گزر گئی ہے میں حیران ہوں کہ آپ کے ایسا بلند آدمی کیا اپنی ایک چھوٹی سی غرض کے لئے اتنا گھٹیا کھیل بھی کھیل سکتا ہے جیسا یہ کھیل آپ نے کھیلا ہے۔ آپ ایک لڑکی کی زندگی سے کھیلے ہیں۔ آپ کی اس ڈائری سے آج پہلی مرتبہ مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ آپ خدا کے فضل سے شادی شدہ بھی ہیں اور صاحب اولاد بھی۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ معصوم اور بے زبان لڑکیاں جب دل ہی دل میں کسی کو اپنا بنا لیا کرتی ہیں تو ان کو اپنی قسمت پر کتنا ناز ہوتا ہے اور جب وہی اپنایا ہوا مرکز انتخاب ان سے دامن بچاتا ہے تو وہ خود اپنی نظروں سے کس بری طرح گر جاتی ہیں۔ اب میں اپنی نظروں سے خود اس قدر گر چکی ہوں کہ اپنے کو واقعی ظفر ہی کے قابل پاتی

اور غفور کے جانے کے بعد میں نے یہ سطریں بھی اس ڈائری میں لکھ دیں پھر اسباب درست کیا اور جب تمام سامان باندھ چکا تو غفور کو بلا کر کہا۔

دیکھو غفور میں تمہاری غزالہ بی بی کی بہتری کے لئے اسی وقت یہاں سے جا رہا ہوں۔ قبل اس کے کہ ملک صاحب بیدار ہوں میرا یہاں سے چلا جانا ضروری ہے۔ یہ میری ڈائری ہے چپکے سے غزالہ بی بی کو دے دینا۔" مگر توبہ کیجئے بھلا غفور میاں ماننے والے تھے زبان کو تو خیر استعمال میں نہ لائے مگر ان کا کچھ نہ کہنا بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا پہلے تو سکتے کے عالم میں کھڑے رہے پھر تمام جسم پر ایک رعشہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور آخر نورانی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ میرے لئے اب مصیبت یہ تھی کہ ملک صاحب کی بیداری کا وقت قریب آ رہا تھا اور بغیر غفور میاں کو سمجھائے ہوئے یہاں سے چلا جانا بھی ممکن نہ تھا۔ اس قسم کے مواقع پر سمجھانے بجھانے کی کوششوں میں جو بدحواسی پیدا ہو جاتی ہے وہ بجائے صفائی کے کچھ اور الجھنیں پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ یہی ہو رہا کہ جس قدر غفور میاں کو سمجھاتے تھے وہ اسی قدر نا سمجھی سے روتے جاتے تھے آخر ایک فیصلہ کن قدم اٹھاتے ہوئے میں نے غفور میاں سے کہا۔

"بھئی تم میری بات سمجھ جاؤ گے تم مجھ کو بالکل حق بجانب سمجھو گے مگر افسوس یہ ہے کہ میرے پاس تم کو سمجھانے کا وقت نہیں ہے اور مجھے سب سے بڑی فکر یہ ہے کہ ملک صاحب جاگ اٹھے تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ تم میرا اسباب لے کر میرے ساتھ چلو میں راستے میں تم کو سب کچھ بتا دوں گا۔"

بغیر کوئی جواب دیئے غفور میاں نے میرا سامان اٹھا لیا اور خاموشی سے میرے ساتھ ہو لئے۔ نالہ پار کرنے کے بعد جب ہم دونوں ملک صاحب کی سرحد سے گزر گئے اور سڑک قریب آ گئی تو میں نے غفور میاں کو سمجھانے کی ایک مرتبہ پھر کوشش کی۔

''دیکھو غفور میرے لئے سوائے اس کے اب کوئی چارہ نہیں کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ میرے یہاں رہنے سے وہ گتھیاں کبھی نہ سلجھ سکیں گی جو تمہاری غزالہ بی بی کے مستقبل کو ڈانواں ڈول بنائے ہوئے ہیں۔ میں جو کچھ ہوں وہ کسی کو معلوم نہیں اور اپنے حالات اس وقت تک ظاہر نہیں کر سکتا جب تک یہاں سے چلا نہ جاؤں اب میں نے اپنا کچا چٹھا اس کتاب میں لکھ دیا ہے جو تمہارے پاس ہے اور جو تم میری طرف سے غزالہ کو دو گے۔ اس کو دیکھنے کے بعد وہ خود سمجھ جائیں گی کہ میرا یہاں رہنا کس قدر غلط تھا۔'

غفور نے بات کاٹ کر کہا۔ ''اب آپ مجھ سے ایک بار پھر کہلوانا چاہتے ہیں تو سن لیجئے کہ آپ چاہے جیسے بھی ہوں مگر غزالہ بی بی آپ کو دل ہی دل میں اپنا چکی ہیں۔''

میں نے اس بحث کو یہیں پر ختم کیا۔ غفور یہی غلط ہے۔ میں اسی لئے یہاں سے جا رہا ہوں کہ بھولی بھالی غزالہ مجھ کو غلط سمجھ رہی ہے اور غلط فہمیوں کا شکار ہے پھر غلط فہمیاں بھی وہ جو خود میں نے پیدا کی ہیں میں اس کے لئے آزاد نہیں ہوں کہ غزالہ مجھ کو اپنا چکی ہیں تو میں بھی ان کو اپنا لوں میں نہ صرف شادی شدہ ہوں بلکہ اپنے بچے کا باپ بھی ہوں۔''

غفور کے ہاتھ سے ہینڈ بیگ چھوٹ گیا اور مجھ کو معلوم ہے کیوں چھوٹ گیا۔ میں نے خود ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اتفاقاً ایک جھوٹ بولا تھا اور پھر اس جھوٹ نے میری زندگی کو یکسر جھوٹ بنا کر رکھ دیا جو کچھ سچ ہے وہ اس ڈائری میں ہے جو تمہارے پاس ہے۔''

غفور ششدر اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھ کو دیکھ رہا تھا اور میں ایک خالی تانگہ قریب آتے دیکھ کر اس طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ سامان تانگے پر رکھوا کر میں نے کچھ نوٹ غفور کے ہاتھ میں رکھ دیئے اور اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم گھبراؤ نہیں میں تم کو خط لکھوں گا اور کیا عجیب ہے کہ ہم پھر ملیں۔'' قبل اس کے کہ غفور پھر آنسو بہائیں ٹانگہ چل چکا تھا۔

☆☆☆

لاہور چھوڑنے اور کراچی پہنچ جانے کی اطلاع بلقیس کو ہو چکی تھی۔ ایک مختصر سا خط لاہور سے روانہ ہوتے وقت اور پھر ایک تفصیلی خط کراچی پہنچنے کے بعد ان کو بھیج چکے تھے۔ خدا خدا کر کے ان کا جواب آیا:۔

حضور، آپ کے دونوں خط مل گئے۔ لاہور سے کراچی جانا مبارک ہو۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ تبدیلی ہر اعتبار سے مبارک ثابت ہوگی۔ معلوم نہیں کیوں جیسے دل کو ایک سکون سا ہو گیا ہے گویا کوئی بہت بڑا بار اتر گیا۔ مجھے واقعی ملک صاحب اور ان کی صاحبزادی سے ڈر لگنے لگا تھا اور ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ کہیں آپ کا یہ جھوٹ میرے لئے ایک خوفناک سچ نہ بن جائے خیر خدا کا شکر ہے کہ آپ اس گرداب سے نکل گئے، جس میں پھنسے ہوئے تو آپ تھے مگر ڈوبنے کا اندیشہ مجھ کو تھا آپ پھر کہیں گے کہ تم خود اعتمادی سے کام نہیں لیتی ہو۔ مجھ کو اپنے اوپر اور آپ پر بے شک اعتماد ہے مگر یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ اعتماد بھی تو آخر ختم ہوا ہی کرتے ہیں۔ اکثر بے اعتمادی اعتماد ہی سے پیدا ہوتی ہے خیر چھوڑیئے ان باتوں کو، سچ تو یہ ہے کہ آپ کے لاہور سے جانے کی خبر پڑھ کر میں نے دو رکعت شکرانہ پڑھا اور مجھے اس کا قطعاً افسوس نہیں ہے کہ کالج کی لگی لگائی ملازمت چھوٹی۔ آپ کی قابلیت سلامت ملازمتیں ہزار ہیں مگر میرے لئے تو تنہا آپ ہی تھے۔ اب خدا کرے کراچی میں آپ کو جلد سے جلد مکان مل جائے مگر سنا ہے کہ لاہور میں تو پھر بھی مکان مل جاتا ہے البتہ کراچی میں سب یہی کہتے ہیں کہ ہم کو مکان کیسے مل سکتا ہے جبکہ ہم بندے ہیں لامکاں کے۔ مگر اس مجبوری کے

معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ ہوٹل سے تنگ آ کر پھر کسی ایسے بزرگ کے یہاں پہنچ جائیں جن کو ملک صاحب کی طرح ضرورت ہو ایک گھر داماد کی اور داماد آج کل بزار اس لئے کہ ضرورت ہے ان کو گھر کی خواہ گھر والی کی ضرورت نہ ہو۔ بہرحال آپ خدا کے لئے ہوٹل ہی میں رہیئے اگر میری قسمت کا ستارہ گردش سے نکل گیا ہے تو آپ کو مکان بھی ضرور مل جائے گا۔ میں نے آپ کے فردوس کو اب بہت پیارا پیارا بنا دیا ہے۔ دیکھئے گا تو پہلے سے زیادہ پیار آئے گا۔ اس کا سلام قبول کیجئے اور خط برابر لکھتے رہیئے تا کہ مجھ کو اطمینان رہے کہ آپ پھر کبھی سسرال میں نہیں پہنچے میکے ہی میں ہیں خواہ وہ ہوٹل ہی میں کیوں نہ ہو۔

آپ کی بلقیس

بلقیس نے یہ ٹھیک لکھا تھا کہ لاہور میں تو خیر پھر بھی مکان مل ہی جاتے ہیں خواہ اسی طرح ملے جس طرح اس خاکسار کو ملا تھا مگر کراچی میں اس طرح بھی مکان نہیں مل سکتا۔ یہاں کے وہ بزرگ بھی جو شادی کے قابل لڑکی کے باپ ہوئے ہوں گھر داماد لانے کا حوصلہ نہیں کر سکتے بلکہ اگر لڑکی کی شادی کا خیال بھی پیدا ہوتا ہے تو اس ضرورت کے تحت کہ یہی کم بخت دفعان ہو تا کہ گھر میں ذرا تو پیر پھیلانے کی جگہ ملے۔ کراچی کے مکانوں میں تو لوگ اس طرح رہتے ہیں جس طرح تھرڈ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں لوگ سفر کرتے ہیں خوش نصیب ہیں وہ گھر والے جن کے پورے کنبے کو صرف ایک ہی کمرہ مل گیا ہے خواہ اس کمرے سے متعلقہ غسل خانے کی حیثیت لمیٹڈ کمپنی کی کیوں نہ ہو۔ وہی ایک کمرہ دن کو باورچی خانہ بن جاتا ہے اور رات کو برتن سمیٹ کر ایک طرف کر دیئے گئے تو بستر پھیلا دیئے گئے پھر لیٹنے میں اقلیدس کی عجیب عجیب شکلیں پیدا کرنا پڑتی ہیں کہ اگر تم اپنا سر ادھر کر لو اور ٹانگیں اس زاویے تک اس سمت میں پھیلاؤ تو دوسرا لیٹنے والا اپنا سر ادھر رکھ کر اپنی ٹانگوں سے اس قسم کا زاویہ بنائے گا۔ اگر تین لیٹنے والے ہوں تو اس مثلث کے ہر دو زاویے دو زاویہ قائمہ کے

برابر ہوتے ہیں جبکہ سونے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ مگر صبح اٹھ کر پتہ چلتا ہے کہ اقلیدس کے علم میں جو خامیاں رہ گئی تھیں وہ راتوں رات ان سونے والوں نے خود پوری کر لی ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ جن صاحب کا سر اقدس جن صاحب کے قدموں میں پڑا ہے ان دونوں کے علیحدہ علیحدہ جسم کہاں ہیں اور شخص اول کا اگر سر نظر آ گیا ہے تو پیر کہاں ہو سکتے ہیں اور پیروں کا پتہ چل گیا ہے تو سر کہیں ہو سکتا ہے اور جب یہ سونے والے بیدار ہو کر واقعی اپنا اپنا سر اپنے اپنے کندھوں پر لئے ہوئے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں تو شبہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں ضرور کچھ نہ کچھ ادل بدل ہو گئی ہوں گی اور اب جھگڑا شروع ہوگا کہ تم میری ٹانگوں کو اپنے جسم میں لگائے ہوئے کہاں جا رہے ہو اور تم اپنے شانوں پر میرا سر کہاں لے چلے۔

مگر اس کے باوجود یہ تو خوش نصیب طبقہ ہے جس کو ایک ہی کمرہ سہی مل تو گیا ہے، ورنہ بے شمار اللہ کے بندے تو سڑکوں کے کنارے ہی پڑے ہوئے ملتے ہیں اس میں شک نہیں کہ اب اس چھوٹے گھر میں بڑے سمدھیانے کی سمائی کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ بستیاں بسائی جا رہی ہیں مگر بقول شاعر

بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

بیگم صاحبہ کو اندیشہ ہے کہ کہیں ان کے سرتاج کو کوئی گھر داماد نہ بنا لے ان کو کیا معلوم کہ یہاں لعنت بھیجی جاتی ہے اس داماد پر بھی جو گھر کا نام بھی لے بلکہ بجائے مہر کے طے یہی کیا جاتا ہے کہ شادی کر کے صرف لڑکی کو لے جاؤ گے یا اس کے کچھ اور عزیزوں کو بھی سر چھپانے کی جگہ دو گے اور اسی معیار پر لڑکے کی معقولیت کو جانچا جاتا ہے کہ صاحب یہ نسبت جو آئی ہے اس میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لڑکے کا مکان ایسا ہے کہ اس میں دو کمرے ہم لوگوں کو بھی مل سکتے ہیں اور اگر اسی وقت کسی ایسے لڑکے کی نسبت آ جائے جو تین کمرے دے سکتا ہو تو پہلی نسبت مسترد اور یہ منظور، ان حالات میں بیگم صاحبہ کے اس اندیشے کا تو

خیر کوئی ذکر ہی نہ تھا البتہ سوال یہ تھا کہ ہوٹل کی زندگی آخر کب تک بسر ہو سکتی ہے۔ ہوٹل کی تکالیف کا ذکر تو اس لئے کفرانِ نعمت ہے کہ ہوٹل میں بھی ایک کمرہ اس لئے مل گیا تھا کہ ہوٹل کے مالک چچا خلیل والد صاحب مرحوم کے بڑے دوستوں میں سے تھے بے تکلفی کی انتہا یہ تھی کہ آخری مرتبہ جب ہمارے یہاں آ کر والد صاحب کے مہمان ہوئے تو دو تین روز کے وعدے پر والد صاحب سے اپنے کاروباری سلسلے میں دو ہزار روپے قرض لے کر جو غائب ہوئے تو اب کراچی میں آپ کی قدم بوسی کا موقع مل سکا، وہ بھی اگر چچا صاحب موصوف کو معلوم ہوتا کہ ان روپے کی اس خاکسار کو اطلاع ہے تو شاید پہچانتے بھی نہیں نہ میں نے اس رقم کا ذکر کیا نہ چچا خلیل نے اس حساب دوستاں کو قابل ذکر بات سمجھا۔ دوسرے مسافروں سے کچھ زیادہ کرایہ اپنے اس عزیز از جان بھتیجے سے طے کر کے بکمال شفقت بزرگانہ ہوٹل میں اس طرح ٹھہرا لیا گویا ایک یتیم کو اپنے سایہ عاطفت میں لے رہے ہیں پھر ہر وقت کی نگرانی کہ بھتیجے کی کیا آمدنی ہے اور ہوٹل کے مقررہ کرایہ کے علاوہ اس آمدنی میں سے کتنا اور اس ہونہار کو ازرہ سعادت مندی چچا جان کو دینا چاہئے، کچھ نہ پوچھئے کہ ان چچا جان سے کس قدر روح فنا رہتی تھی اور کس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتے تھے کہ خدا جانے چچا کہاں چُوکہ دے جائیں۔

ملازمت کے سلسلے میں البتہ کوئی دقت نہ ہوئی، کراچی پہنچنے کے بعد ہی ایک مقامی کالج میں تقریبا ویسی ہی جگہ مل گئی جیسی چھوڑی تھی اور اب فکر تھی کسی ایسی جگہ کی جس کو مکان کہہ سکیں اور ادھر چچا خلیل کی یہ کوشش کہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر چہیتے بھتیجے سلمہٗ کو گھر نہ ملے ورنہ پالا پوسا بھتیجا ہاتھ سے بے ہاتھ ہو جائے گا۔ جہاں ان کو اپنے کسی سی آئی ڈی سے اطلاع ملی کہ یہ حضرت فلاں مکان طے کر رہے ہیں بس ان کے گھوڑے دوڑنا شروع ہو گئے اور اس وقت تک دم نہ لیتے تھے جب تک کہ مکان کے مالک کو ورغلا کر

مکان نہ دینے پر یا وہ مکان کسی اور کو دینے پر آمادہ نہ کرلیں۔ دو تین مرتبہ مکان کا معاملہ طے کیا کرایہ طے ہوگیا، پگڑی کی رقم طے ہوگئی بلکہ پگڑی کے علاوہ طرّہ بھی طے ہوگیا کہ یکا یک معلوم یہ ہوا کہ وہ مکان کوئی اور صاحب لے اڑے اور تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ اس پردہ زنگاری میں جو معشوق تھا وہ ہمارے بزرگ محترم چچا خلیل ہی تھے، زہر کا گھونٹ پی پی کر رہ گئے اور کر ہی کیا سکتے تھے۔

☆☆☆

ایک تو ہوٹل پھر چچا خلیل کا ہوٹل، کریلا اور نیم چڑھا، بڑی خوبیوں کے ہیں یہ بزرگ اور نہایت ہی ذات شریف واقع ہوئے ہیں۔ یہ ہوٹل جناب نے یہ کہہ کر الاٹ کرایا ہے کہ متعدد عظیم الشان ہوٹل چھوڑ کر آیا ہوں اور جس طرح مہاجرین کا ایک طبقہ لاکھوں سے کم کی بات نہیں کرتا اسی طرح چچا خلیل بھی اپنی ریاست اور امارت کے پل باندھنے میں بڑی مشق فراہم کر چکے ہیں اور اب تو میں ان کو مل گیا تھا۔ جھوٹی سچی گواہی کی جہاں ضرورت ہوئی اور ہاتھ اٹھا دیا اس خاکسار کی طرف کہ میاں پوچھ لو ان سب سے سب کچھ ان کا دیکھا بھالا ہے کہ کیا تھے اور کیا بن کر آئے ہیں یہاں۔ یہ تو ٹھیک بھی ہے کہ کیا تھے اور کیا بن کر آئے ہیں۔ تھے صرف یہ کہ احباب کو دھوکہ دینے کی بزنس فرماتے تھے مگر پھر بھی پھٹیچر کے پھٹیچر رہتے تھے اور بن کر آئے ہیں لکھ پتی اور دعویٰ یہ ہے کہ لکھنو میں ایک مسوری میں دوسرا اور شملہ میں تیسرا ہوٹل چل رہا تھا خود شان سے دہلی میں رہتے تھے۔ ذاتی کوٹھی تھی جس میں لاکھوں کی آرائش تھی مگر قسمت میں یہ دن دیکھنا بھی لکھا تھا کہ ایک ایسے ہوٹل سے روزی بندھ کر رہ جائے گی چنانچہ اب گویا زندگی کے دن پورے کر رہے تھے اور گواہی لی جاتی تھی اس خاکسار سے جس نے ہمیشہ اپنے ان محترم و معظم چچا کو اپنے یہاں اس طرح مہمان دیکھا تھا کہ ہر دسویں پندرھویں دن ایک یکے پر بیٹھے تشریف لا رہے ہیں، دری میں رسیوں سے بندھا ہوا بستر اور رنگ اڑا ہوا ایک ٹرنک ساتھ ہے۔ والدہ صاحبہ کو جیسے ہی جناب کی تشریف آوری کی اطلاع ہوئی اور وہ والد صاحب کے پاس پہنچیں۔ ''لو مبارک ہو وہ

تشریف لے آئے ہیں تمہارے خلیل خاں۔ اس کم بخت نے تو جیسے گھر ہی دیکھ لیا ہے۔ بس اب سریس لگا کر چپک ہو جائیں گے اور والد صاحب مسکرا کر فرمادیا کرتے تھے کہ ”بری بات ہے مہمان سے گھبرایا نہیں کرتے، مہمان خدا کی رحمت ہے خواہ خلیل خان ہی کیوں نہ ہو۔“ والدہ صاحبہ کسی اور مہمان سے کبھی نہ گھبراتی تھیں بلکہ عام عورتوں سے اس معاملہ میں وہ بہت مختلف تھیں نہایت مہمان نواز اور بے حد متواضع البتہ ان حضرت سے ان کو للّٰہی بغض تھا وجہ یہ کہ وہ مہمان یہاں نہ آتے تھے بلکہ کبھی کبھی خود اپنے گھر مہمان جایا کرتے تھے ورنہ زیادہ غریب خانے ہی پر قیام رہتا تھا اور اس شان سے کہ گویا علاقہ پر تحصیل وصول کے لئے تشریف لائے ہوئے ہیں مثلاً کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے اور آپ تشریف لے آئے نہایت لفافہ قسم کا بستر لئے ہوئے ایک دری ایک تکیہ اور ایک دلائی اور بس، ظاہر ہے کہ والد صاحب سے یہ ناممکن تھا کہ وہ اس بستر میں ان حضرت کو دیکھ کر نہ پوچھتے کہ میاں سردی نہیں لگے گی اس بستر میں اور وہ اس سردی پر اس طرح تعجب کا اظہار فرماتے گویا جہنم سے تشریف لا رہے ہیں۔ ”صاحب کیا عرض کروں یہ تو خیال ہی نہ تھا کہ برف ہی کٹ رہی ہوگی میں تو خود پریشان ہوں کہ رات کیونکر بسر ہوگی۔“ بس اتنا سا اشارہ کافی ہوتا تھا اور فوراً نہایت گدگدا بستر معہ لحاف کے حاضر کر دیا جاتا تھا جسے وہ جاتے وقت اپنی اسی دری میں باندھ کر لے جاتے تھے۔ کبھی لحاف لے گئے کبھی چسٹر پہن گئے، کبھی کچھ اور کبھی کچھ، یہ باتیں اس وقت تو خیر زیادہ بری نہ لگتی تھیں مگر اب ضرور جی چاہتا تھا کہ والد صاحب ہوتے اور ان حضرت کے یہ رنگ دیکھتے کہ شام کو حقہ بھروایا کرسیاں ڈلوائیں اور ہوٹل کے پروپرائٹر صاحب دربار لگا کر بیٹھ گئے۔ انقلاب 47، کو گالیاں دی جا رہی ہیں پاکستان کو صلواتیں سنائی جا رہی ہیں اور اپنا وہ زمانہ یاد کیا جا رہا ہے جو خیر سے کبھی گزرا ہی نہ تھا کہنے لگے۔

”صاحب ان صاحبزادے سے پوچھئے یہ میرے لئے اولاد کے برابر ہیں ان کے

باوا جان سے میرے ایسے ویسے مراسم نہ تھے، ہائے اب وہ دوست کہاں ملتے ہیں، وہ بھی صاحب اپنے زمانے کے نہایت باوضع رئیسوں میں تھے۔ صاحب ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں جامدانی کا لانگر کھا پہنے ان کے یہاں جو پہنچا تو مرحوم بے حد خوش ہوئے۔ مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کرلیں میں نے پوچھا حضرت یہ کیا حرکت کہنے لگے خلیل بھائی نظر نہ لگ جائے پہلے صدقہ اترواؤں گا پھر نظر بھر کر دیکھوں گا۔ چنانچہ جناب اسی وقت نظر اتاری گئی۔ دوسرے دن میں نے جامدانی کے دو تھان بھجوا دیئے۔ اب تو جناب آنکھوں سے لگانے کے لئے بھی وہ جامدانی نہ ملے گی اور مل بھی جائے تو اس زندگی میں جامدنی کا کیا مزہ۔ وہ جامدانی تو اسی وقت لطف دیتی تھی کہ اس کو پہنا اور اعلیٰ درجے کی لینڈو یا موٹر پر نکل گئے ہوا خوری کو، مجھے لباس کے بعد اگر کسی چیز کا شوق تھا تو وہ موٹر ہے۔ کیوں برخوردار تم نے وہ بیوک تو دیکھی ہوگی جو 45ء میں خریدی تھی میں نے۔"

عرض کیا۔ "کیا کہنا ہے اس بیوک کا، شہر کے تمام رئیس دیکھنے آتے تھے اسے۔"

اور چچا میاں اس گواہی پر فوراً چائے کا آرڈر دے دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ چچا میاں سے جھوٹ بلوانے میں لطف آنے لگا۔ الطاف صاحب بھی اسی ہوٹل میں مستقل طور پر رہتے تھے اور ان غریب کے حالات بھی کچھ اپنے ہی جیسے تھے کہ بیوی بچے کہیں پڑے ہیں خود کراچی میں ملازم ہیں اور سر چھپانے کی جگہ ہوٹل ہے۔ آدمی نہایت زندہ دل اور نہایت مہذب، اب اس کو غریب الوطنی کہیئے یا ہم مذاقی کہ الطاف صاحب سے بہت جلد مراسم پیدا ہوگئے۔ ان کو معلوم تھا کہ ہمارے یہ چچا جان محترم کس قسم کے بزرگ ہیں اور ان کو چچا جان کی باتوں میں بڑا لطف آتا تھا۔ ہم دونوں مل کر جس وقت چچا خلیل سے جھوٹ بلواتے تو لطف ہی آجاتا مگر اس عقل کے دشمن کو قطعاً احساس نہ ہوتا کہ سمجھنے والے اس کو کیا سمجھ رہے ہیں۔ الطاف کی اداکاری کمال کی ہوتی تھی نہایت سنجیدگی سے کوئی شوشہ چھوڑ دیتا اور پھر چچا

خلیل جھوٹ کے پل باندھنا شروع کر دیتے۔ مثلاً الطاف نے نہایت سنجیدگی سے کہہ دیا۔
''معاف کیجئے گا خلیل صاحب ایک بات پوچھنے کو بہت جی چاہتا ہے مگر ہمت نہیں ہوتی آج جی کڑا کر کے پوچھے عی لیتا ہوں کہ کیا کبھی کلکتہ میں بھی قیام رہا ہے۔''

نہایت بھولی صورت بنا کر بولے۔ ''کیوں خیریت تو ہے۔''

الطاف نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کی پیشانی اور آنکھیں جہاں آرا کجن سے اس قدر مشابہہ ہیں کہ ایسی مشابہت میں نے تو دیکھی نہیں۔''

ایک دم گویا چور سے بن کر خاموش ہو گئے لور پھر مجھ سے متوجہ ہو کر بڑے استعجاب سے فرمایا۔
''بھئی یہ شخص نہایت خطرناک ہے، بلا کا ذہین ہے، بخدا میری یہ چوری آج تک کسی نے نہیں پکڑی تھی جوان حضرت نے پکڑی ہے۔ صاحب قصہ یہ ہے کہ یہ بھی جوانی کی ایک لغزش تھی خدا معاف کرے۔ مگر الطاف میاں مان گئے تم کو۔''

اب ایک مفروضہ داستان عشق فی البدیہہ سنا ڈالی کہ کجّن سے کیا تعلقات تھے کتنے دن تعلقات رہے اس سلسلے میں کیسے کیسے رئیسوں سے ٹکر لی اور آخر کجّن کو کس طرح تڑپتا ہوا چھوڑا ہے اور آخر میں اس خاکسار سے گواہی لی جا رہی ہے کہ ''تمہارے باوا جان کو تو سب معلوم تھا اور میری کون سی بات تھی جوان کو معلوم نہ تھی بس وہ دو باتوں سے بہت جلتے تھے ایک میرے اس شوق سے دوسرے میرے ریس کے شوق سے اور ٹھیک بھی جلتے تھے۔ بھلا غضب خدا کا بمبئی میں ہز ہائنس آغا خاں کی چوٹ پر بازیاں لگ رعی ہیں۔ ریس میں کہاں وہ کہاں میں، مگر روپیہ فالتو تھا تم کو تو سب معلوم ہوگا اب بولتے کیوں نہیں۔''

عرض کیا۔ ''اب میں کیا بولوں بزرگوں کی باتوں میں مگر خوب اڑایا ہے آپ نے بھی روپیہ۔'' کہنے لگے۔ ''بھئی اب قسم لے لو جو میں نے کبھی کسی کو روپیہ دیا ہو ہم تو اب ننانوے کے پھیر میں پڑے ہیں۔''

میں اور الطاف دونوں چند ہی دن میں اس دن رات کے جھوٹ سے عاجز آ گئے اور دونوں مل کر کورس میں دعائیں مانگتے تھے کہ اگر دونوں کو علیحدہ نہیں تو ایک مشترک ہی مکان مل جائے کہ ان حضرت سے تو نجات ملے۔

☆☆☆

دن بھر کالج میں طالب علموں کو اپنا بھیجہ کھلانا، شام کو تھکے ہارے ہوٹل میں آنا اور پھر چچا خلیل کے تصور سے لرزنا کہ کہیں وہ حضرت نازل نہ ہو جائیں کہ باقی ماندہ دماغ وہ چاٹنے بیٹھ جائیں کبھی اگر الطاف صاحب کے ساتھ پروگرام بن گیا تو پکچر چلے گئے ورنہ دماغ پچی کراتے رہے چچا خلیل سے، یہ رہ گیا تھا زندگی کا معمول، زندگی کا محبوب ترین مشغلہ ڈائری لکھنا اسی دن سے چھوڑ دیا تھا جب ملک صاحب کے گھر کو خیر باد کہا ہے مگر اب بھی جب کبھی بستر پر پہنچتے اور نیند کا انتظار کرتے تو ملک صاحب اپنی تمام شفقتوں کے ساتھ تصویر میں ابھر آیا کرتے تھے۔ غفور کی وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اب بھی سامنے آجایا کرتی تھیں اور نیند اچاٹ ہو کر رہ جاتی تھی۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ ملک صاحب کو ایک معذرت نامہ ہی لکھ دیں مگر خدا بزدلی کا بھلا کرے کہ اتنی دور بیٹھ کر بھی ہمت نہ ہوتی تھی اور یہ خاموشی اس معصوم جرم کو اور بھی سنگین بناتی چلی جارہی تھی۔ عجیب عجیب خیال آتے تھے کہ معلوم نہیں غزالہ نے اپنے باپ کو وہ ڈائری دکھائی یا نہیں، معلوم نہیں خود غزالہ نے بھی معاف کیا یا نہیں، معلوم نہیں ظفر اور غزالہ کا قصہ کس منزل تک پہنچا ہے۔ الطاف صاحب سے مراسم اس حد تک ہو چکے تھے کہ ان کو بھی ملک صاحب کے یہاں کا پورا قصہ معلوم تھا مگر اس گتھی کو سلجھانے کی کوئی ترکیب بتانے سے وہ بھی قاصر تھے مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ شامت جب آتی ہے تو ہمیشہ اس راستے سے آتی ہے جس کی طرف شبہ بھی نہ ہو چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ایک دن کالج میں کلاس لینے کے بعد نکلے ہی تھے کہ چپراسی نے اطلاع دی کہ آپ کے کمرے میں کچھ صاحبان منتظر ہیں۔ یہ خبر پاتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے اور اجنبی مہمانوں کا

خیر مقدم کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرت مقامی ریڈیو اسٹیشن سے تشریف لائے ہیں اور ایک ہنگامی تقریر کے سلسلہ میں اس خاکسار کو آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ تقریر کا موضوع کچھ ایسا اپنے مزاج کا تھا کہ انکار نہ کر سکے اور پرنسپل سے رسمی اجازت لے کر ریڈیو کے نمائندوں سے وعدہ کر لیا کہ میں ضرور تقریر کروں گا۔ بس یہ تقریر کرنا قیامت بن گیا اور سارا بھانڈا اس طرح پھوٹا کہ تقریر کے چوتھے ہی دن ریڈیو کے وہی حضرات پھر تشریف لائے اور ایک دوسری تقریر کے لئے آمادہ کرنے کے علاوہ ایک لفافہ بھی دے گئے کہ آپ کا یہ خط ریڈیو کے پتہ پر آ گیا تھا۔ ان حضرات کے رخصت ہونے کے بعد اب جو خط دیکھتے ہیں تو ملک صاحب کا، ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی ملک صاحب نے آخر گرفتار کر ہی لیا، جلدی جلدی خط پڑھنا شروع کیا۔

شفقت میاں، دعائیں، وہی مثل صادق آئی کہ

تو جہاں جا کے چھپ ہم نے وہیں دیکھ لیا

ایک عجیب الجھن اور ایک عجیب معمہ اس طرح حل ہوا کہ کل غزالہ بی بی نے یکا یک اپنی والدہ کو دیوانہ وار ریڈیو سیٹ کی طرف گھسیٹا اور آپ کی آواز سنا دی پھر مجھ کو طلب کیا گیا اور میں آپ کی تقریر سنتا رہا۔ غفور میاں بھی ریڈیو کے قریب آ گئے اور اس طرح تقریر سنتے رہے کہ آخر آپ کی چچی کو ڈانٹنا پڑا کہ یہ کیا بدشگونی ہے اللہ اس کی عمر میں برکت دے وہ خیر سے ہے اور اللہ رکھے تقریر کر رہا ہے یہ تو خوش ہونے کا مقام ہے۔ بہر حال رات تقریر سننے کے بعد معلوم ہوا کہ جیسے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن دکھائی دی ہے۔ اب تک تو ہم لوگ صرف اندھیرے میں آپ کو ٹٹول رہے تھے مگر ٹاپتے پھر رہے تھے۔ اب ایک امید یہ پیدا ہوئی ہے کہ شاید ریڈیو والے میرا یہ خط آپ تک پہنچا دیں اور آپ کو معلوم ہو سکے کہ جن لوگوں کو آپ چھوڑ گئے ہیں وہ آپ کے لئے کیا احساسات اب بھی رکھتے ہیں۔ آپ کے

جانے کے بعد دو دن تک تو کچھ سمجھ ہی نہ آیا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ سوائے اس کے کہ میں دیوانہ وار آپ کی تلاش میں سرگرداں رہا مگر تیسرے دن میاں غفور کو غالباً میری حالت زار پر رحم آیا اور ان سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کوئی کتاب عزیزہ غزالہ کو دے گئے ہیں میں نے وہ کتاب غزالہ سے حاصل کی اور اسے پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار میں نے اس کو پڑھا اور میری سمجھ آ گیا کہ آپ کیوں یہاں سے چلے گئے۔

شفقت میاں آپ نے جو فیصلہ کیا اور جو قدم اٹھایا۔ ان حالات میں آپ کو یہی کرنا چاہئے تھا لیکن اگر آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ میں اور میری بیوی اس غلط فہمی کے علاوہ آپ کے لئے کیا احساسات رکھتے تھے تو شاید آپ یہ قدم نہ اٹھاتے۔ اس غلط فہمی کی روشنی میں مجھ کو یقیناً غزالہ کے لئے آپ سے بہتر بر کی امید نہ تھی مگر غزالہ سے قطع نظر میں آپ کو اپنی اولاد نرینہ بھی سمجھتا تھا اور آپ کی سعادت مندی سے ہم دونوں میاں اس قدر متاثر تھے کہ ہمارے دلوں میں آپ کے لئے سوائے محبت کے اور کچھ تھا ہی نہیں بلکہ آج میں آپ کو لکھتا ہوں کہ میری بیوی واقعی بہت عقل مند ہیں میں تو ان کے دست حق پرست پر بیعت کر لیتا اگر وہ میری بیوی نہ ہوتیں جس زمانے میں آپ یہاں تھے اور ظفر کی اصلاح اور ظفر سے مصالحت کے لئے کوشاں تھے اسی زمانے میں میری بیوی نے کہا تھا کہ شفقت کی اس کوشش کے معنی سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ کسی نہ کسی وجہ سے غزالہ سے شادی نہیں کر سکتا یا نہیں کرنا چاہتا ورنہ وہ ظفر سے میل جول کرانے کی کوشش ہرگز نہ کرتا۔ شریف آدمی ہے لہٰذا صاف انکار نہیں کرتا البتہ اپنی ان باتوں سے اپنا مطلب ظاہر کر رہا ہے اس وقت تو میں نے اپنی بیوی کو ناقص العقل سمجھا تھا مگر اب پتہ چلا ہے کہ دراصل ناقص العقل خود میں تھا۔

بہرحال آپ اپنے دل سے یہ بات بالکل نکال دیجئے کہ ہم لوگ آپ سے رنجیدہ یا ناخوش ہیں۔ آپ نے جس مجبوری کے تحت اپنے حالات کو چھپائے رکھا اور یہ ایک راز داری

آپ کو جس طرح سراپا راز بناتی چلی گئی اس کا ہم سب کو اندازہ ہے اور تو اور خود غزالہ کل سے یہی کہہ رہی ہے کہ اب تو میرے بھائی جان کا پتہ چل گیا ہے اب تو میں بھائی کے لئے ترسنے کے بجائے ان کو یہاں بلواؤں گی ان سے پردہ نہ کروں گی۔ ہم لوگوں نے بھی اس کو تم سے پردہ اٹھا دینے کی پوری اجازت دے دی ہے اور میرے ذہن میں تم سے متعلق بہت سی تجاویز آ رہی ہیں مگر یہ تجاویز اس وقت لکھوں گا جب تم اس خط کا جواب دو گے اور اپنا پتہ لکھو گے تاکہ مجھے یہ اطمینان ہو سکے کہ میرا خط تم کو مل گیا ہے اور باقی خطوط بھی ملتے رہیں گے۔ تمہاری چچی تم کو بہت بہت دعا لکھوا رہی ہیں۔ غفور بھی سلام لکھوانے پر مصر ہیں غزالہ کہتی ہے کہ میں خود اپنے قلم سے اپنے بھائی جان کو کچھ لکھوں گی لہٰذا میں یہ خط جواب کی امید پر ختم کرتا ہوں۔

تمہارا خیر خواہ ملک محمود احمد"

ملک صاحب کے خط کے بعد دو سطریں غزالہ نے بھی اسی خط میں لکھی تھیں۔

"میرے بھائی جان!

اپنی نادیدہ بہن کا سلام قبول کیجئے۔ ابا جان کے خط سے اور سب کے متعلق آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ سب کا دل آپ کی طرف سے کس قدر صاف ہے مگر میں اتنا اور بتانا چاہتی ہوں کہ اسی بہانے خدا نے مجھ کو جو بھائی دیا ہے اس کو چاہئے کہ وہ اندازہ کرے کہ بہن کے احساسات اور بھائی کے لئے ترستی ہوئی بہن کے احساسات کس قدر نازک ہوتے ہیں۔

"غزالہ"

اس خط کو پڑھ کر بوجھ تو سر سے اتر ہی گیا تھا مگر اب جلدی یہ تھی کہ کسی طرح یہ خط الطاف صاحب کو دکھا کر جلد سے جلد اس کا جواب لکھا جائے۔ ملک صاحب اور ان کے گھر بھر کی شرافت نے اس خط میں تو واقعی بے داموں خرید لیا۔"

☆☆☆

ملک صاحب اور غزالہ سے خط و کتابت باقاعدہ جاری تھی اور اس خط و کتابت نے زندگی کے جمود میں ایک خوشگوار حرکت پیدا کردی تھی۔ ملک صاحب کا اب اصرار یہ تھا کہ جس طرح بھی ہو لاہور واپس آجاؤ اور غزالہ کی ضد یہ تھی کہ بھابھی اور فردوس کو فوراً بلالو، ملک صاحب اپنا مکان پیش کررہے تھے بلکہ آخری خط میں تو یہ دھمکی بھی تھی کہ اگر تم نے لاہور پہنچنے میں تساہل برتا تو میں خود جاکر اپنی بہو اور پوتے کو لے آؤں گا۔ پھر تم خود جھک مار کر آؤ گے۔ میں ان کو لکھ چکا تھا اور واقعہ بھی یہی لکھا تھا کہ ملازمت کوئی کھیل تو ہے نہیں کہ آدمی کھیلتا رہے جب چاہا چھوڑ دی اور جب چاہا حاصل کرلی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ وہ برابر مصر تھے کہ ملازمت مل جائے تو سبحان اللہ ورنہ ملتی رہے گی ملازمت فی الحال میرا جو کچھ ہے وہ سب تمہارا ہی ہے اور آخری خط میں تو ان بزرگ محترم نے کمال ہی کردیا تھا کہ بلقیس اور فردوس کو پاکستان بلانے کے سلسلے میں تمام سرکاری کارروائی کی تکمیل کی اطلاع مجھ کو دے دی کہ میں نے پاکستان کے پرمٹ آفس اور ہندوستان کے پرمٹ آفس دونوں جگہ کوشش کرکے تمہاری بیوی اور بچے کے بلانے کا پورا انتظام کرلیا ہے اب یا تو تم خود جاکر ان کو لے آؤ ورنہ میں آجاتا ہوں ان کو لینے۔ اس خط سے اندازہ ہوا کہ معاملہ رسمی تکلفات سے گزر کر کس حد تک سنجیدہ ہو چکا ہے۔ میں تو میں الطاف صاحب بھی سخت حیران تھے کہ کیا دنیا میں ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ اب تک تو وہ یہی کہتے تھے کہ یہ تمام باتیں اس قدر افسانوی رنگ میں سامنے آرہی ہیں کہ گویا ایک کہانی ہے جس میں دلچسپی بڑھانے کے لئے افسانہ گو زیب داستان والے ٹکڑے زیادہ سے زیادہ بڑھا رہا ہے۔ الطاف صاحب کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ ملک صاحب لاکھ بھلے آدمی سہی ان کی بیوی اور لڑکی لاکھ شریف سہی مگر یہ تو وہ

باتیں ہیں جو عموماً اس دنیا میں ہوا ہی نہیں کرتیں۔ اس سلوک کی امید آج کل اپنوں سے بھی نہیں ہو سکتی پھر ملک صاحب تو بالکل ہی غیر ہیں۔ کبھی کبھی الطاف صاحب اسی قصے پر غور کرتے ہوئے کندھے پر تولیہ ڈالے منہ میں برش لئے ہوئے چلے آتے اور ایک دم کہنے لگتے۔ "بھئی شفقت صاحب میں کہتا ہوں کہیں ان بڑے میاں کا کوئی اور مطلب تو نہیں ہے۔" اور جب میں یہ کہتا کہ اور مطلب ہی کیا ہو سکتا ہے تو وہ بھی لاجواب ہو کر کہتے۔ "یہی میں بھی غور کرتا ہوں مگر پتے کی بات یہ ہے کہ سمجھ میں نہیں آئی یہ بات، فرض کر لیجئے کہ بڑے میاں کو آپ سے عشق صادق ہی سہی مگر بیوی کیوں طرفدار ہیں۔ جس قسم کے وہ میاں بیوی ہیں ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ شوہر کی توجہ وہ آپ کی طرف دیکھتیں تو محض اس لئے آپ سے بیزار ہو جاتیں کہ آپ ان کے شوہر کے ایسے محبوب دوست ہیں۔ ننانوے فیصدی بیویاں اپنے شوہروں کے احباب سے ناراض ہوتی ہیں۔ اپنے شوہر کے ہر عیب کا ذمہ دار وہ شوہر کے احباب کو ٹھہراتی ہیں اور کچھ للّٰہی بغض ہوتا ہے شوہر کے دوستوں سے، نئے زمانے کی بے پردہ اور سوسائٹی میں دخل رکھنے والی آزاد خواتین اس سلسلے میں شدت پسند تو نہیں ہوتیں اس لئے کہ وہ شوہر کے ساتھ ہی رہتی ہیں مگر اس کے باوجود اگر کبھی بھی شوہر اپنے کسی دوست سے غیر معمولی دلچسپی لینے لگے اور کسی مشغلے میں دونوں ساتھ ساتھ شریک ہو جائیں پھر دیکھئے بیگم صاحبہ کا جلاپا، تو بھئی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ میاں اور بیوی دونوں ہی آپ کو پسند کرنے کے سلسلے میں ہم خیال کیسے ہو گئے۔"

عرض کیا جاتا۔ "ممکن ہے اس میں کچھ میری شرافت اور سعادت مندی کا بھی جادو ہو۔"

الطاف صاحب اسی چکر میں واپس جاتے ہوئے کہتے۔ "ہو سکتا ہے مگر بھئی ذہن میں اترتی نہیں یہ بات۔"

[illegible] واقعی یہ بات خود اپنے ذہن میں بھی نہ اترتی تھی مگر اب اس خط کے آنے کے بعد

تو اس سوچ بچار کا موقع ہی نہ تھا۔ لہٰذا یہ خط لئے ہوئے میں سیدھا ہوٹل پہنچا شکر ہے کہ الطاف صاحب مل گئے مقصد یہی تھا کہ ان سے مشورہ کیا جائے اور سر جوڑ کر بیٹھنے کے بعد کوئی عملی قدم اٹھایا جائے۔ میں نے ہوٹل پہنچتے ہی الطاف صاحب کے سامنے آج کا خط ڈالتے ہوئے کہا۔ ’’ملاحظہ فرمایئے مولانا آج یہ خط آیا ہے۔ اسے پڑھ کر...... الطاف صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ’’یاد کیجئے ہجے اور معنی۔‘‘

عرض کیا۔ ’’بندہ نواز پانی سر سے گزر چکا ہے اب حیلوں بہانوں سے کام نہیں چلے گا۔ ملک صاحب کو آپ نہیں جانتے میں واقف ہوں ان حضرت سے سند باد جہازی کو جن بزرگ تسمہ پا سے واسطہ پڑا تھا ہمارے ملک صاحب اسی سلسلۂ عالیہ سے تعلق رکھتے ہیں بخشنے والے نہیں ہیں۔ شفقت پدری میں طوفان آ چکا ہے۔ بہر حال آپ پڑھ لیجئے یہ خط پھر کوئی مشورہ دیجئے گا۔‘‘

الطاف صاحب کو یہ خط دے کر میں کپڑے بدلنے اور ہاتھ منہ دھونے اپنے کمرے کی طرف آ ہی رہا تھا کہ چچا خلیل اپنے ملازم سے سر میں تیل ڈلواتے ہوئے نظر آ گئے۔ سر میں تیل ڈلوانے سے جو سرور پیدا ہوتا ہے اس نے ان کی خطرناک آنکھوں کو نیم وا کر رکھا تھا مگر اسی حالت میں مجھ کو دیکھ کر آواز دی۔ ’’میں نے کہا۔ یہ کہاں الگ ہی الگ، ذرا بات تو سنو۔‘‘ چچا خلیل کی بس یہی حرکت زہر لگتی ہے کہ لاگو ہو کر رہ گئے ہیں کسی کو کمرے کے باہر دیکھا اور دبوچ لیا۔ اب کوئی کہاں تک کمرے سے ان کے ڈر کے مارے نہ نکلے۔ بہر حال اس وقت تو گرفتار ہو ہی گئے تھے بخوشی ان کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا اور حاضر ہونے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ کام کتنا ضروری تھا اور بھی آگ لگ کر رہ گئی۔ اپنے قریب دیکھتے ہی بولے۔ ’’میاں تمہیں میری قسم ذرا یہ تیل سونگھ کر دیکھو۔‘‘

کچھ پتہ نہ چلا کہ چچا جان تیل کی تعریف چاہتے ہیں یا برائی اس قسم کے مواقع پر کچھ

عجیب گول سی بات کرنا پڑتی ہے۔ چنانچہ تیل سونگھ کر عرض کیا۔ ''چہ خوش'' چچا میاں نے اس مہمل سے ''چہ خوش'' سے اپنی تائید کا پہلو نکال کر فرمایا۔ ''اب ذرا ان حضرت کو یقین دلاؤ کہ اس قسم کے تیل سر میں ڈالنا تو درکنار ہم لوگ اپنے لڑنے والے مینڈھوں کے سینگوں پر بھی نہ لگاتے تھے۔ مگر اب وقت پڑ گیا ہے تو یہ تیل بھی پڑے گا ہمارے سر میں سر ہلکا کرنے کے بجائے سر بھاری کرنے کی ضرورت ہو تو تم بھی دبوا لو یہ تیل میری مجبوری تو یہ ہے کہ دو گھنٹہ تک سیاسی بحث کر کے آ رہا ہوں جی چاہا کہ ذرا سر میں تیل ڈلوا لوں اب تیل جو سر میں پڑا تو ان حضرت سے صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ باز آئے ہم تیل ڈلوانے سے تم تو کسی طرح بس اسی تیل کو سر میں کھپا دو۔ تم کو تو یاد نہ ہوگا شفقت میاں البتہ تمہارے والد جانتے تھے کہ میں تو چنبیلی کے تازہ پھول اپنے چمن سے بھیج کر خود تیل نکلوایا کرتا تھا۔''

یہ انداز تھا اس گفتگو کے چھڑنے کا جس کو سننے کے لئے سر میں نہ صرف فالتو دماغ کی ضرورت تھی بلکہ یہ گفتگو گھڑی بند کر کے وقت کے انداز سے بے نیاز ہو کر عموماً سنی جاتی تھی مگر اس وقت دل اٹکا ہوا تھا اس خط میں جس کو الطاف صاحب پڑھ رہے تھے اور پڑھنے کے بعد کوئی مشورہ دینے والے تھے لہٰذا چچا میاں سے کہنا پڑا کہ ''میں ذرا ضروری کام سے جا رہا ہوں واپسی پر مجلس رہے گی۔'' اور قبل اس کے کہ چچا میاں کوئی جواب دیں وہاں سے چلتے بنے۔ بات یہ ہے کہ ان حضرت کا کیا تھا، اپنا ہوٹل اپنا وقت اور اپنے نو تصنیف افسانے جھوٹ بولنا ان کی واحد تفریح تھی اور یہی ایک خوشی تھی جو لے دے کر ان کے حصے میں رہ گئی تھی، مگر سوال تو یہ تھا کہ ان کی خوشی پر دوسرے اپنی فرصتوں اور اپنے مشاغل کی قربانی کیوں پیش کریں۔ سعادت مندی کی ایک حد ہوا کرتی ہے جس سے عرصہ ہوا گزر کر حماقت کی منزلیں طے کر رہے تھے مگر اب طبیعت بغاوت پر آمادہ ہوتی جاتی تھی۔

☆☆☆

بلقیس کے خطوط برابر آتے رہتے تھے اور اب ان کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ملک صاحب نے نہ صرف میرا پتہ چلالیا ہے بلکہ وہ یہ بھی طے کر چکے ہیں کہ میں پھر لاہور واپس جاؤں اور بیوی بچوں کو بلالوں۔ اس انکشاف نے بلقیس کی رائے میں وہ انقلاب عظیم پیدا کر دیا کہ وہ تو ملک صاحب اور ان کے خاندان کی گویا ارادت کیش بن کر رہ گئیں کہ جس بزرگ محترم کو میں اتنا خطرناک سمجھ رہی تھی وہ تو رحمت کا فرشتہ نکلا کہ مجھ کو بھی بلوانے کا انتظام کر رہا ہے۔ میں نے غزالہ کو ایک خط میں خود اسی کے اصرار پر بلقیس کا پتہ لکھ بھیجا تھا چنانچہ آج جو بلقیس کا خط آیا وہ غزالہ کی شان میں قصیدے کی حیثیت رکھتا ہے۔ معلوم ہوا کہ غزالہ نے بلقیس کو براہ راست خط لکھ کر بحیثیت نند کے بھاوج سے نہایت خوشگوار تعلقات بالا ہی بالا قائم کر لئے اور ان کو تمام حالات لکھ بھیجے کہ ان کو بلوانے کے انتظامات کس سرگرمی کے ساتھ ہو رہے ہیں اور اگر بھائی صاحب یعنی یہ خاکسار خود لینے نہ گیا تو ابا جان یعنی ملک صاحب ان کو لینے کے لئے پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ بلقیس نے بے حد متاثر ہو کر لکھا ہے کہ:

''میں تو خدا کی قسم سخت حیران ہوں کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں اور میں آپ سے کہہ نہیں سکتی کہ کس قدر شرمندہ ہو رہی ہوں کہ میں نے ایسے بھلے لوگوں کے لئے یہ رائے قائم کی تھی کہ یہ لوگ مجھ پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں توبہ توبہ۔ ذرا غور کیجئے کہ آپ نے اپنی چھوٹی سی غرض کے لئے کیسا جھوٹ بولا تھا اور اس جھوٹ کو ملک صاحب قبلہ کے یہاں رہ کر کیسا پروان چڑھایا مگر اس کے باوجود ان سب کے احساسات یہ ہیں۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ

ملک صاحب قبلہ ضرور یا تو رحمت کے فرشتے ہیں ورنہ اس سے کوئی نہ کوئی خونی رشتہ میرا یا آپ کا ہے اور اگر یہ کچھ بھی نہیں ہے تو سوائے اپنی اور آپ کی خوش قسمتی کے اور میں کیا کہہ سکتی ہوں کہ ایسے شفیق بزرگ بیٹھے بٹھائے مل گئے۔ میں نے عزیزہ غزالہ کو لکھ دیا ہے کہ میں آنے کے لئے بالکل تیار ہوں اور جو کوئی بھی مجھ کو لینے آ گیا میں روانہ ہو جاؤں گی۔ مگر کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ آپ خود ہی لینے آ جائیں۔ یہاں سب عزیزوں سے بھی مل لیں گے اور چھوٹے ہوئے وطن کو ایک مرتبہ پھر دیکھ لیں گے.....''

غزالہ اب عزیزہ غزالہ ہوگئی تھی۔ ملک صاحب ترقی کر کے ملک صاحب قبلہ بن گئے تھے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا تھا کہ بیچاری بلقیس جسے یہاں آنے کی کوئی امید ہی نہ تھی۔ ان ہی لوگوں کی وجہ سے اس قابل ہو سکی تھی کہ اپنی تنہائیوں میں میاں کے پاس پہنچنے کا تصور تو کر سکتی تھی۔ میں نے بلقیس کا یہ خط بھی الطاف صاحب کی پیشی میں پیش کر دیا۔ الطاف صاحب اب اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ سوائے اس کے اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یار ملک صاحب معہ اپنے متعلقین کے کسی دماغی خرابی میں مبتلا ہیں اور جس طرح ہر پاگل کو کوئی نہ کوئی دھن سوار ہو جاتی ہے اسی طرح ان حضرت کو تمہاری دھن سوار ہے ورنہ تم واقعی نہایت خوش قسمت ہو۔ بہر حال بہت کچھ غور کرنے کے بعد ہم دونوں نے فیصلہ یہی کیا کہ اب خط و کتابت سے کام نہ چلے گا بلکہ کالج سے چھٹی لے کر لاہور جانا ہی پڑے گا۔ ورنہ ملک صاحب مارے خلوص کے شاید خود ہی بلقیس کو لینے روانہ ہو جائیں۔ الطاف صاحب کی یہ رائے نہایت معقول تھی کہ بلقیس اور فردوس کو اب بلانا تو ہے ہی مگر کراچی کی ملازمت چھوڑنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بلقیس پاکستان آ کر فی الحال ملک صاحب کے یہاں رہ سکتی ہیں اور جب کبھی کراچی میں مکان ملا ان کو آسانی سے بلایا جا سکتا ہے۔ ورنہ کراچی کے بے شمار ملازمت پیشہ ایسے بھی تو ہیں کہ خود یہاں ملازمت کر رہے ہیں اور بال بچے کسی

اور شہر میں ہیں، چھٹیوں میں گئے اور جا کر مل آئے ورنہ کراچی کی آبادی کے اگر تمام اعداد و شمار اپنے اپنے متعلقین بھی یہاں بلا لیتے پھر تو گولی مار نام کی نو آبادی نہ ہوتی بلکہ محکمہ بحالیت اس کو مجبوراً اپنا مشغلہ بنا کر آبادی کا تناسب برقرار رکھ سکتا تھا۔ بہرصورت الطاف صاحب کی رائے پر عمل کرتے ہوئے طے یہی پایا کہ رخصت کی درخواست دے کر فی الحال لاہور اور لاہور سے بلقیس کے پاس پہنچیں اور ان کو لاہور پہنچا کر واپس آ جائیں پھر دیکھا جائے گا۔ مکان کی کوشش کبھی نہ کبھی تو کامیاب ہو ہی جائے گی۔ میں نے لاکھ لاکھ الطاف صاحب کو سمجھایا کہ "بندہ نواز مکان کی امید اس وقت تک تو کرنا ہی بیکار ہے جب تک آپ اس ہوٹل میں چچا خلیل کے زیر سایہ رہ رہے ہیں۔ اب تک یہ حضرت کئی ملے ملائے مکان چھڑوا چکے ہیں اور ان کو دن رات یہی فکر ہے اور چاہے جو کچھ بھی ہو مگر ہم لوگوں کو مکان نہ ملنے پائے۔ ہر وقت ان کے جاسوس ہمارا پیچھا کرتے رہتے ہیں کہ کہیں ہم مکان کی تلاش میں تو نہیں گئے ہیں۔"

الطاف صاحب نے منہ بنا کر کہا۔ "حضرت معاف کیجئے گا۔ وہ ٹھہرے آپ کے چچا مگر میرا پروگرام کچھ اور ہی ہے اور وہ یہ کہ میں بھی ان کو چچا بنا کر چھوڑوں گا۔ آپ کو معلوم نہیں یہ شخص نہایت جرائم پیشہ اور نہایت حرام خور بھی ہے۔ اس ہوٹل میں تو اب کسی شریف آدمی کو یوں بھی نہیں رہنا چاہئے۔ عجیب عجیب مشاغل ہونے لگے ہیں اس ہوٹل میں، جوا تو خیر یہ بزرگ عرصے سے کھلواتے ہیں اور مشغلے کے بدولت کافی آمدنی ہے ان کی مگر اب تو آپ کے یہ چچا جنرل سپلائر بھی ہو گئے ہیں۔ آپ تو کالج گئے ہوئے تھے، یہاں ایک عجیب قصہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ پولیس نے چھاپہ مار کر دو لڑکیاں برآمد کی ہیں......"

میں نے حیرت سے کہا۔ "لڑکیاں؟ اس ہوٹل سے؟"

الطاف صاحب نے کہا۔ "جی ہاں لڑکیاں جو اغوا کرائی گئی ہیں۔ وہ جو نمبر چودہ میں

خان صاحب آئے ہوئے ہیں وہ اسی کارِ خیر کے لئے تشریف لائے ہیں اور آپ کے چچا جان نے اس سے کافی رقم لے کر اپنے کارندوں سے یہ اغوا کرایا جس کا پولیس کو بروقت پتہ چل گیا مگر افسوس تو یہ ہے کہ خود یہ مردود بچ گیا ہے کسی نہ کسی ترکیب سے۔''

یہ ذکر ہو ہی رہا تھا کہ کمرے کی چلمن اٹھا کر چچا خلیل نے آتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

الطاف صاحب نے جلدی سے کہا۔ ''کہیئے خان صاحب کیا ہوا۔''

چچا خلیل نے ذرا تردد سے کہا۔ ''ہوگا تو خیر کیا۔ مگر خواہ مخواہ کی بدنامی ہے۔ کرے کوئی بھرے کوئی۔ اب کوئی پوچھے بھلا مجھ کو کیا معلوم کہ جو عورتیں آ رہی ہیں وہ مسافروں کی ماں بہنیں ہیں یا بھگائی ہوئی ہیں۔ ایک بات البتہ ذرا ٹیڑھی یہ پیدا ہوگئی ہے کہ وہ جو بیرا ہے جگنو اس نمک حرام نے اپنے بیان میں میرا نام لکھوا دیا ہے کہ گویا میں نے اس سے یہ لڑکیاں اٹھوائی تھیں۔''

میں نے اجنبی بن کر کہا۔ ''میری تو سمجھ ہی میں نہیں آ رہا ہے بات کیا ہے۔''

چچا نے فرمایا۔ ''بتا دیں گے پوری بات یہاں ایک قصہ ہو گیا ہے۔ بہر حال الطاف صاحب اب ذرا آپ سے کام لینا ہے اور وہ یہ کہ وہ جو پولیس افسر یہاں آیا تھا جس سے آپ کی بے تکلفی بھی ہے اس کو ذرا سمجھائیں کہ ایک شریف آدمی کے پیچھے نہ پڑے اس طرح، اگر کچھ مٹھی گرم کرنا چاہتے ہو تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں مگر ہوٹل کی بدنامی نہ ہونے پائے۔''

الطاف نے صاف صاف کہہ دیا۔ ''دیکھئے خان صاحب بات یہ ہے کہ اوّل تو وہ پولیس آفیسر اس قسم کا آدمی نہیں ہے کہ رشوت سے اس کو رام کیا جائے، رشوت کے سلسلے میں پولیس بدنام ہو کر رہ گئی ہے۔ ورنہ یہ واقعہ ہے کہ پولیس میں بھی ایماندار لوگ ہوتے ہیں۔ دوسرے میں اس قصہ میں پڑنا ہی نہیں چاہتا مجھ کو تو آپ اپنے ہوٹل کا صرف ایک مسافر سمجھیں۔''

چچا خلیل اس صاف جواب پر حیران اس لئے نہ ہوئے ہوں گے کہ الطاف صاحب کو

وہ ہمیشہ سے نہایت منہ پھٹ اور صاف قسم کا آدمی سمجھتے ہیں۔ وہ تو یہ صاف جواب سن کر چلے گئے اور میں نے اپنی جگہ سوچنا شروع کیا کہ واقعی ملک صاحب کتنی سچی بات کہتے تھے کہ ہوٹل کی زندگی شریفانہ ہو ہی نہیں سکتی۔ ان کے پیش نظر غالباً اسی قسم کے ہوٹل ہوں گے۔

☆☆☆

ادھر میں چھٹی لے چکا ادھر ہوٹل کا قصہ طول پکڑ گیا تھا اور آثار کچھ ایسے نظر آرہے تھے کہ چچا خلیل کا صرف لائسنس ہی ضبط نہ ہوگا بلکہ وہ خود بھی ضبط کر لئے جائیں گے اور اگر پولیس نے ان کے ساتھ واقعی رعایت نہ برتی تو سزا بھی ہو جائے گی۔ چچا خلیل لاکھ حرفوں کے بنے سہی لاکھ جرائم پیشہ سہی مگر آج کل ان کی حالت نہایت قابل رحم ہو رہی تھی یہاں تک کہ خود مجھ کو الطاف صاحب کی خوشامد کرنا پڑی کہ اگر کوئی صورت ہو سکے تو اس کم بخت چچا کو نجات دلا دو۔ ٹھوکر کھا چکا ہے شاید اب کچھ سنبھل جائے ورنہ آج ہی سہی کل بھگتے گا اپنے اعمال کا نتیجہ، بہت کچھ کہنے سننے کے بعد الطاف صاحب اس بات پر راضی ہو گئے کہ اپنے دوست پولیس افسر کو چائے پر بلا کر اس حد تک سفارش کر دیں گے جس حد تک سفارش میں معقولیت پائی جا سکے۔ کوئی غیر قانونی رعایت یا رشوت وغیرہ کی ترغیب نہ دیں گے۔ میں اس بات پر تیار ہو گیا بلکہ چچا خلیل نے فرمایا کہ چائے کا انتظام میرے سر رہا تو بھی الطاف صاحب نے کہہ دیا کہ یہ قطعاً غلط ہے یہ چائے آپ کے ہوٹل میں بھی نہ ہوگی کسی اور ہوٹل میں ہوگی تاکہ اس بیچارے پر یہ بار بھی نہ ہو کہ جس ہوٹل کا قصہ وہ لئے ہوئے ہے اسی ہوٹل میں دعوتیں اڑاتا پھرتا ہے۔ میں نے بھی چچا خلیل کو سمجھا دیا اور ان سے طے کر لیا کہ آپ اسی ہوٹل میں جہاں یہ چائے ہو موجود رہیئے گا تاکہ اگر ضرورت پڑی تو آپ کو بلایا جا سکے ورنہ آپ تو اس چائے میں بھی شریک نہ ہوں تاکہ آپ کا قضیہ طے کرانے میں آسانی رہے۔

الطاف صاحب نے دوسرے ہی دن ان پولیس افسر یعنی شعیب صاحب کو ایک دوسرے ہوٹل میں چائے پر بلا لیا مجھ سے تعارف کرایا اور جب ہم تینوں بے تکلف دوست بن چکے تو شعیب صاحب نے کہا۔ ''مجھے تو حیرت ہے کہ آپ لوگ اس ہوٹل میں کیسے رہ رہے ہیں صاحب یہ تو بدمعاشوں کا پورا اڈہ ہے۔ شرابیں یہاں چلیں، جوئے کی پھڑ یہاں جمے، عورت بازیاں یہاں ہوں......''

میں نے کہا۔ ''ہم لوگ اپنی خوشی سے اس ہوٹل میں نہیں ہیں۔ مکان کے نام کی اگر کوئی چیز بھی مل جائے تو آج ہی لعنت بھیج دیں اس ہوٹل پر۔''

شعیب صاحب نے بھی مکان کا نام سن کر وہی حرکت کی جو اور سب کیا کرتے ہیں۔ آج کل مکان کا نام سن کر لوگ چہرے پر سوالیہ نشان لٹکا لیا کرتے ہیں۔ اسی طرح شعیب صاحب نے بھی مکان کا نام سن کر تین چار مرتبہ زیر لب کہا۔ ''مکان ...... مکان مکان'' اور پھر بڑی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں صاحب مکان تو واقعی ایک پرابلم ہے۔''

قطع کلام کرتے ہوئے عرض کیا۔ ''جی نہیں پرابلم تو حل ہو جایا کرتے ہیں یہ تو پرابلم کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔''

شعیب صاحب نے کہا۔ ''مگر میرا مطلب یہ تھا کہ اور بھی تو ہوٹل ہیں جہاں آپ شریفانہ زندگی بسر کر سکیں اسی جرائم کے اڈے کا انتخاب کیوں کیا ہے۔''

عرض کیا۔ ''میرے ایک بزرگ کا قول ہے کہ ہوٹل میں شریفانہ زندگی بسر ہی نہیں ہو سکتی۔''

شعیب صاحب نے ایک قطعیت کیساتھ کہا۔ ''یہ تو غلط ہے میرے خیال میں تو اس کا کلیہ نہیں بنایا جا سکتا میں تو جب جانوں کہ آپ یا الطاف یا ایسا ہی کوئی ذمہ دار آدمی ہوٹل کھولے اور پھر ہوٹل جرائم خانہ بنے۔ میرے خیال میں تو ناممکن ہے۔ اسی کراچی میں بے

شمار ہوٹل ہیں اگر سب ہی ایسے ہوتے تو مصیبت ہی آ جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ ہوٹل میں چونکہ بھانت بھانت کے مسافر آتے جاتے رہتے ہیں۔ لہٰذا احتیاط ذرا مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔ پھر بھی اگر ہوٹل کا مالک اور ہوٹل کے منتظمین خود جرائم پیشہ نہ بنیں تو میرے نزدیک یہ ممکن نہیں کہ ہوٹل میں جرائم پناہ لے سکیں۔ مگر ہوتا دراصل یہ ہے کہ بہت سے لوگ وہ حرکتیں جو گھروں پر نہیں کر سکتے ہوٹل کا ایک کمرہ کرایہ پے لے کر کھل کھیلتے ہیں اور ہوٹل کے منتظمین ان کو روسیاہی میں امکانی سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں اور ان سہولتوں کے معاوضے منہ مانگی رقم کی صورت میں لیتے ہیں خود آپ کے ہوٹل کے مالک نے اپنے ہوٹل کو جوا خانہ الگ بنا رکھا تھا۔ شراب خانہ الگ تھا یہ ہوٹل اور قحبہ خانہ کی حیثیت بھی اس کو حاصل تھی۔

الطاف نے موقع پا کر کہا۔ ”اچھا بھئی شعیب ایک بات صاف صاف بتاؤ۔ ہوٹل کے مالک کو پھانس تو لیا ہے تم نے لیکن کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ وہ بچ سکے.....“

شعیب نے کہا۔ ”اگر ایمانداری سے کام لیا جائے تو کوئی صورت ایسی نہیں ہے۔ آپ کو معلوم نہیں اس کم بخت کے ہاتھ پیروں نے اس کے خلاف بیان دیئے ہیں اور میں تو چاہتا ہوں کہ ایسے حرام خوروں کو عبرت انگیز سزائیں دی جائیں تاکہ شریفانہ زندگی تو بسر ہو سکے۔ اب میں آپ کو بتاؤں کہ وہ لڑکیاں جو اس ہوٹل سے پکڑی گئی ہیں خود خواہ کیسی ہی ہوں مگر ان کے بزرگوں کو شرافت کی غلط فہمی بھی تھی اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اس قسم کے ہوٹل قائم رہے تو شرفا، اپنی شرافت سے بھی مطمئن نہ رہ سکیں گے میں تو بہر حال ان حضرت کو چھوڑتا نہیں۔“

الطاف نے کہا۔ ”یہ تو میں کہہ نہیں سکتا کہ ان حضرت کے انفعال میں صداقت کی مقدار کیا ہے مگر منفعل بے حد ہے۔“

شعیب نے کہا۔ ”اجی توبہ کیجئے۔ یہ پیشہ ور بدمعاش کہیں منفعل ہو سکتے ہیں ان کا

انفعال بھی ان کی بد معاشی کا ایک پرتو ہے۔ میں تو ان حضرت کو ان کی سزا کو پہنچا کر رہوں گا۔"

الطاف اور شعیب باتیں کر رہے تھے اور میں کسی گہری فکر میں کھویا ہوا تھا آخر اس گمشدگی کو شعیب نے محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اور جناب کیا فکر سخن فرما رہے ہیں۔ ایک عجیب زاویے پر آکر چائے کی پیالی رک گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے حضور کہیں اور ہیں۔"

میں نے اپنی گمشدگی اور بازیابی دونوں کو بیک وقت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں میں ایک بات سوچ رہا تھا۔ تو آپ خلیل خان صاحب کو کسی طرح نہیں چھوڑ سکتے۔ اچھا فرض کر لیجئے کہ وہ ہوٹل ہی چھوڑ دیں۔'

الطاف نے غور سے میری طرف دیکھا کہ میں بک کیا رہا ہوں اور شعیب صاحب نے بڑی شرافت سے کہا۔ "صاحب مجھ کو خلیل خان سے کوئی خاندانی بیر تو ہے نہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ چھوڑ دیئے جائیں تو ان کو چاہئے کہ ہوٹل کا دھندا چھوڑ کر کوئی اور شغل اختیار کریں اور ہوٹل کسی محتاط قسم کے آدمی کے سپرد کر دیں۔"

میں نے الطاف سے کہا۔ "میرے خیال میں یہ تجویز خلیل خان کے سامنے پیش کر دی جائے اگر وہ اس پر آمادہ ہوں تو ہوٹل کا خریدار میں ان کو آج دے سکتا ہوں ....."

شعیب نے کہا۔ "اور نئے مالک کو ہوٹل کا لائسنس دلانے کا ذمہ دار میں ہوں۔ آپ یہ تجویز خلیل خان صاحب کے سامنے رکھ دیجئے اگر وہ مان جائیں تو سبحان اللہ ورنہ میں اپنا فرض پورا کرنے میں کوتاہی نہ کروں گا۔"

شعیب صاحب سے اجازت لے کر میں کمرے کے باہر نکلا اور چچا خلیل کو ساتھ لے آیا جو باہر ہی منتظر تھے۔ شعیب نے ان کو دیکھتے ہی کہا۔ "آیئے خان صاحب وکیل تو آپ نے بڑے اچھے مقرر کئے ہیں مگر حضور میں آپ کو سرکاری مہمان بنائے بغیر نہ رہوں گا۔ ہاں ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر آپ ہتھکڑیوں سے بچنا چاہتے ہیں تو یہ ہوٹل بیچ کر کوئی اور

دھندا کیجئے اور ہوٹل کسی معقول آدمی کو چلانے دیجئے۔"

خلیل خان نے مسکین صورت بنا کر کہا۔ "میں تو خود اس ہوٹل سے تنگ آ چکا ہوں......"

شعیب نے بات کاٹ کر کہا۔ "دیکھئے خان صاحب جھوٹ بولنے کی سند نہیں۔ ہوٹل سے آپ ہرگز تنگ نہیں آئے ہیں۔ یہ باتیں تو آپ کسی اور سے کہیے گا البتہ اب اگر نجات چاہتے ہیں تو بند کیجئے یہ کاروبار ورنہ خود بند ہو جائیں گے آپ۔"

خان صاحب نے کہا۔ "مگر سرکار میں اتنی جلدی ہوٹل کا خریدار کہاں سے لاؤں گا۔"

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "اس کا ذمہ دار میں ہوں آپ یہ فرمایئے کہ آپ کے خیال میں ہوٹل کا معاوضہ آپ کو کیا ملنا چاہئے۔"

خان صاحب نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔ "اے جناب جو کچھ بھی مل جائے میں اس کو بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سمجھوں گا۔"

میں نے کہا۔ "پھر بھی آپ کے خیال میں وہ لنگوٹی کس قدر ہونا چاہئے۔"

خان صاحب نے کہا۔ "صاحب از روئے قاعدہ تو مجھ کو ہوٹل کے سامان وغیرہ کو ملا کر تیس ہزار تک کا سودا ہو جائے تو نقصان نہ رہے گا۔"

شعیب نے کہا۔ "لاحول ولاقوۃ۔ کون آپ کو اس ہوٹل کے تیس ہزار دے دے گا۔ ہے ہی کیا آپ کے ہوٹل میں۔ بارہ تیرہ کمرے ہیں ان میں بارہ تیرہ مسہریاں، بارہ تیرہ میزیں، تیس چالیس کرسیاں، دو چار صوفہ سیٹ اور اسی قسم کا کچھ کباڑ۔"

خان صاحب نے کہا۔ "اور حضور قالین، آئینے، برتن، غسل خانوں کے سیٹ۔"

شعیب نے کہا۔ "یہ سب کچھ ملا کر بیس ہزار بھی آپ کو مل جائیں تو غنیمت سمجھئے۔"

خان صاحب نے کہا۔ "چلئے میں تیار ہوں مگر کون ہے جو ایک دم سے یہ سودا بھی

کرے۔"

میں نے کہا۔ آپ بات پکی کیجئے سودا میں کرائے دیتا ہوں ابھی مگر شرط یہ ہے کہ اگر آپ کے ہوٹل پر کچھ اور بار ہوگا تو اس کا ذمہ دار نیا مالک نہ ہوگا۔"

خان صاحب نے کہا۔ "جی ہرگز نہیں۔ میں خود ذمہ دار ہوں گا۔ اوّل تو اور کوئی بار ہے ہی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "سنئے چچا میاں بیس ہزار میں اس طرح معاملہ طے ہوسکتا ہے کہ دو ہزار آپ کو وہ بھی چھوڑنا پڑیں گے جو آپ والد صاحب سے قرض لا چکے ہیں۔"

بڑی بھولی سی صورت بنا کر خان صاحب دو منٹ کے لئے جیسے کھو سے گئے اس کے بعد یکایک جیسے چونک کر بولے۔ "وہ...... اچھا وہ ...... ہاں یاد آ گئی وہ رقم، گلے گلے پانی منظور، آپ اٹھارہ ہزار دلوا دیجئے......"

میں نے کہا۔ "ہوگیا سودا میں ہوٹل چل کر آپ کو اٹھارہ ہزار کا چیک دیئے دیتا ہوں۔ اور لکھائی پڑھائی ہوئی جاتی ہے۔"

الطاف سخت حیران بیٹھے تھے آخر وہ بھی چپ نہ رہ سکے اور بڑے تعجب سے پوچھا۔ "سودا تو آپ اس طرح کر رہے ہیں جیسے خود ہی ہوٹل چلانے کا ارادہ ہو۔"

میں نے کہا۔ "ہاں آپ یہی سمجھئے قصہ دراصل یہ ہے کہ ہمارے ملک صاحب خود بھی ایک ہوٹل کے مالک رہ چکے ہیں اور اپنے ہونے والے داماد میاں ظفر کو ہوٹل کھلوا چکے ہیں مگر ان کی ذاتی بے عنوانیوں کے بدولت ہوٹل ہی نہیں بلکہ ظفر صاحب بھی تباہ ہوگئے اب میں ان کے لئے یہ ہوٹل لئے لیتا ہوں اور وہ رقم جو ان کے یہاں رہنے کی وجہ سے میں نے پس انداز کی ہے چچا میاں کو پیش کئے دیتا ہوں تاکہ ہوٹل ان سے اور یہ ہوٹل کے سلسلے کی اس مصیبت سے بھی نجات پا جائیں اور میں اپنی نگرانی میں ظفر سے ہوٹل چلوا کر ملک

صاحب کو اس بات کا قائل کر سکوں کہ دراصل ہوٹل کوئی غیر شریفانہ جگہ نہیں ہوتی بلکہ اس کو بنانے والے جیسا بنا دیتے ہیں ویسا ہی بن جاتا ہے۔ میں اس ہوٹل کو معیاری ہوٹل بنا کر دکھاؤں گا۔"

شعیب نے کہا۔ "بیشک میرا تو یہی خیال ہے یہ کاروبار شرافت کے ساتھ بھی چلایا جاسکتا ہے اور ترقیاں کی جاسکتی ہیں۔"

اور پھر خان صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے شعیب نے کہا۔ "لیجئے خان صاحب آپ کی بلا تو ٹل گئی، میں ان احباب سے وعدہ کر چکا ہوں کہ اگر خان صاحب ہوٹل چھوڑ دیں تو میں بھی ان کو چھوڑ دوں گا۔ اب میں اپنے افسران بالا سے آپ کی سفارش کر کے اس معاملہ کو طول نہ دوں گا مگر یہ بات آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے اس ہوٹل کے بعد بھی اپنی سرگرمیوں میں اصلاحی صورت پیدا نہ کی تو میں پھر آپ کے سر پر تعینات نظر آؤں گا۔ اس وقت تو شفقت صاحب آڑے آگئے مگر ہمیشہ ایسے سینہ سپر آپ کو نہ ملیں گے۔"

خان صاحب اس وقت نہایت سعادت مند بنے ہوئے تھے خدا ان کی اس سعادت کو استقلال عطا فرمائے۔

☆☆☆

شعیب صاحب کے مشورے سے جب میں ایک وکیل صاحب سے ہوٹل کی ملکیت اور خریداری سے متعلق مسودہ بنوا کر ہوٹل واپس آیا تو الطاف صاحب میرے ہی انتظار میں اپنے کمرے کے سامنے ٹہل رہے تھے مجھ کو دیکھ کر قریب آتے ہوئے بولے۔ ''صاحب آپ بھی عجیب معمہ نکلے۔ میری سمجھ میں تو جناب والا کی شخصیت آئی نہیں۔''

میں سمجھ تو گیا کہ یہ کیوں کہہ رہے ہیں مگر کچھ اور سمجھنے کے لئے کہا۔ ''کیا مطلب آپ کا۔'' کہنے لگے۔ ''واقع ہوئے ہیں ماہر تعلیمات بسر کر رہے ہیں مسافرانہ زندگی، کمر باندھے ہوئے تیار ہیں لاہور کے سفر پر اور معاملت کر رہے ہیں ہوٹل کی۔ کوئی پوچھے جناب کو اس کاروبار کا کیا تجربہ ہے اور آپ یہ ہوٹل کا بکھیڑا پھیلائیں گے یا اپنی نوکری کریں گے۔ ملک صاحب آپ کو مستقلاً لاہور بلا رہے ہیں اور آپ اپنی گردن یہاں پھنسائے ہوئے ہیں تا کہ لاہور جا ہی نہ سکیں۔

میں نے الطاف کو اپنے کمرے میں لا کر اطمینان سے بٹھانے کے بعد کہا۔ ''بھائی جان آپ مجھ کو عقل سے اتنا بیگانہ تو غالباً نہ سمجھتے ہوں گے کہ یہ سامنے کی باتیں بھی گویا میرے ذہن میں نہ آئی ہوں گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان تمام امور پر غور کرنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ملک صاحب کے اتنے احسانات میرے سر پر ہیں کہ ان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا اور اب بھی یہ طے نہیں ہے کہ وہ میری اس پیشکش کو قبول کریں گے۔ مگر ظفر میاں جوان کے ہونے والے داماد ہیں ان کو ٹھکانے سے لگانے کی

صرف یہی ایک صورت ہے۔ کراچی میں ہوٹل کے کاروبار کے لئے بہت بڑا امیدان ہے اور اگر سلیقہ اور شرافت سے یہ کام کیا جائے تو کامیابی یقینی ہے۔"

الطاف صاحب نے کہا۔ "اب غالباً آپ مجھ کو کودن سمجھ رہے ہیں۔ اتنی سی بات گویا میں نہیں جانتا مگر سوال تو یہ ہے کہ آپ ٹھہرے قلم دوات کے آدمی یہ بھلا آپ کے بس کا روگ ہے، دوسرے آپ تو آج کل میں لاہور اور پھر وہاں سے بیگم کو لینے جارہے تھے۔ یہ بیچ ادھر میں کیا سوجھ گئی۔

عرض کیا۔ "آپ نے دو باتیں کہی ہیں اور میں ان دونوں کا جواب دے کر آپ کو مطمئن کرنا چاہتا ہوں۔ ہم لوگ بے شک منشی قسم کے آدمی ہیں مگر خدا نے تھوڑا بہت سلیقہ آپ کو بھی دیا ہے۔ اور غالباً آپ کے اس غلام کو بھی، ہوٹل چلانے کے لئے کشتی تو لڑنا پڑتی نہیں کہ میں ورزش شروع کردوں۔ ہوٹلوں میں رہتے رہتے تھوڑی بہت واقفیت تو ہو ہی گئی ہے کہ ہوٹل کو معقول صورت سے چلانے کے لئے کیا کچھ کرنا چاہئے۔ میرے ذہن میں اس ہوٹل کے لئے جو اسکیم ہے وہ نہایت امید افزا ہے اور مجھے کامیابی کی پوری امید ہے دوسرے کرنا تو سب کچھ ظفر کو ہے۔ جس کو میں بڑی حد تک آدمی بنالایا ہوں۔"

الطاف صاحب نے کہا۔ "مگر جناب کو غالباً یہ نہیں معلوم کہ اس صورت میں آپ کا کراچی میں مستقل طور پر رہنا کس قدر ضروری بن جاتا ہے۔"

عرض کیا۔ "مگر جب ہوٹل اپنا ہوگیا تو رہنے کے سلسلے کی سب سے بڑی رکاوٹ ایک حد تک دور ہوسکتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ بیوی بچے کو لے کر ہوٹل میں کیونکر رہو گے اس کا جواب یہ ہے کہ کیا کراچی میں ہم کو کبھی بھی مکان نہ ملے گا۔ جب تک مکان نہ ملے اس وقت تک اگر اسی ہوٹل کی اوپر والی منزل ہم لوگ اسی طرح اپنے لئے مخصوص کرلیں جس طرح چچا خلیل نے اس کو دولت خانہ بنا رکھا تھا تو کیا برا ہے۔"

الطاف صاحب نے واقعی بیوقوف سمجھتے ہوئے کہا۔ ''مولانا یہ تو درست ہے، مگر سوال تو یہ ہے کہ ملک صاحب قبلہ آپ کو کراچی میں رہنے بھی دیں گے یا نہیں۔''

عرض کیا۔ ''حضور والا یہی تو اس مجبوری کو ختم کرنے کی ایک ترکیب ہے کہ جب میں اتنی بڑی ذمہ داری یہاں لے لوں گا تو وہ مجبور ہو کر رہ جائیں گے۔ اور مجھ کو لاہور میں رکھنے پر اصرار نہ کر سکیں گے۔ بات یہ ہے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ اب جبکہ میری پوزیشن بالکل صاف ہو چکی ہے میں اپنا اور نہ صرف اپنا بلکہ بیوی اور بچے کا بھی باران پر ڈالوں صاحب آپ ان بزرگ کو جانتے نہیں۔ اس بات کو آپ قطعی ناممکن سمجھ لیجئے کہ میں لاہور میں رہ کر کہیں اور رہ سکوں گا اور اس سے زیادہ ناممکن بات یہ ہے کہ ان کے گھر پر رہ کر اپنا خرچ علیحدہ کر سکوں۔ ان باتوں سے وہی بات پیدا ہو جائے گی جس کو وہ دل شکنی کہتے ہیں اور آپ ہی بتائیے کہ میرے لئے یہ کیونکر ممکن ہے اور میری غیرت کیونکر گوارا کر سکتی ہے کہ میں اپنا اور بیوی بچے کا باران پر ڈالوں میں تو اس ترکیب میں ہوں کہ جو باران پر پہلے ڈال چکا اس کا کسی طرح بدلہ اتار کر سبکدوش ہو جاؤں۔ حالاں کہ اس کی امید بہت کم ہے مگر اتنا تو ہو ہی جائے گا کہ میں لاہور کے بجائے کراچی میں رہنے کا امکان پیدا کر لوں گا اور وہ شاید بخوشی نہ بھی سہی تو بھی مجبورا میرے کراچی میں رہنے پر راضی ہو جائیں گے۔''

الطاف صاحب نے کہا۔ ''سمجھ گیا۔ اچھا اب یہ بتائیے کہ ہوٹل کا سودا کرنے کے بعد جناب کا پروگرام کیا ہے۔''

عرض کیا۔ ''ہوٹل کا سودا تو ابھی ہوا جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ میری عدم موجودگی میں فی الحال تو جس طرح ہوٹل چل رہا ہے چلاتے رہیئے، میں واپس آ کر اپنے معیار اور اپنی حیثیت کے مطابق اصلاحی اسکیم پر عملدرآمد شروع کر دوں گا۔''

الطاف صاحب نے حیران ہو کر کہا۔ ''آپ کا مطلب یہ ہے کہ گویا مجھ کو المشتہر مالک

کمپنی ہذا کے فرائض انجام دیتا ہوں گے۔"

عرض کیا۔ "صرف میری عدم موجودگی میں نہیں بلکہ میری واپسی کے بعد بھی۔"

ایک عجیب انداز سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ "ایک بات بتاؤ کہ تم کو میری کس بات سے یہ اندازہ ہوا ہے کہ میں اس قدر چغد واقع ہوا ہوں کہ خواہ مخواہ کا درد سر مول لے لوں گا۔ شاید جناب کو یہ علم نہیں کہ میں سرکاری ملازم بھی ہوں اور سرکاری ملازمت میں ایک عجیب لغویت یہ ہوا کرتی ہے کہ آدمی کو روز کے روز دفتر میں حاضری بھی دینا پڑتی ہے۔"

عرض کیا۔ مگر اس کے باوجود ہوٹل کی نگرانی ہو سکتی ہے۔ مجھ کو جناب کی صلاحیتوں کا اس سے زیادہ علم ہے جتنا خود بدولت کو ہوگا۔ لہٰذا میں نے کچھ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے میں اب کسی ترمیم کی گنجائش نہیں۔"

الطاف صاحب کچھ اور کہنے ہی والے تھے کہ چچا خلیل نازل ہو گئے اور آتے ہی نہایت مستعدی سے بولے۔ "کیوں بھئی چلنا ہے شعیب صاحب کے پاس۔"

عرض کیا۔ "میں ان کے پاس ہو آیا ہوں۔ ان کے اور وکیل صاحب کے مشورے سے یہ مسودہ تیار ہو گیا ہے اور یہ رہا کاغذ جس پر آپ اس مسودے کو نقل کریں گے اس کے بعد ہم دونوں معہ الطاف صاحب اور شعیب صاحب کے رجسٹریشن آفس جائیں گے جہاں لین دین کی تکمیل ہو جائے گی۔"

چچا خلیل نے عینک نکال کر مسودہ نہایت غور سے پڑھا۔ آدمی بے حد کائیاں ہیں لہٰذا دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مسودہ پڑھ چکنے کے بعد نہایت اطمینان سے بولے۔ "یہ تو ٹھیک ہے مگر کیا مجھ کو اپنی رہائشی جگہ بھی چھوڑنا پڑے گی۔"

الطاف صاحب نے کہا۔ "آپ خود ہی غور کیجیے کہ اب اس جگہ پر آپ کا کیا حق رہ جاتا ہے۔ دوسرے آپ کی موجودگی میں ہوٹل کے نظم کو درست کرنے کا سوال مشکل ہی سے پیدا

ہو سکے گا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شعیب نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا ہے۔"

چچا خلیل نے سپردگی کے انداز سے کہا۔ "بہتر ہے صاحب ملک خدا تنگ نیست، بہر حال اب تشریف لے چلئے شعیب صاحب کے پاس میں تیار ہوں۔" اور ہم تینوں روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

کراچی کی طرف سے ہر طرح کا اطمینان کر لینے کے بعد اور ہوٹل کی پوری ذمہ داری الطاف صاحب کو سونپ کر ایک تار تو بیگم صاحبہ کو دیا اور دوسرا ملک صاحب کو اور شکر ہے کہ جو پروگرام اس تار میں لکھا تھا اسی کے عین مطابق لاہور پہنچ گئے۔ امید کے عین مطابق ملک صاحب قبلہ اسٹیشن پر موجود تھے غفور میاں بھی ایک طرف آنکھوں میں مسرت کی چمک لئے موجود تھے اور تو اور ظفر صاحب بھی بالکل آدمیوں کی صورت میں نظر آئے بلکہ جس وقت ان لوگوں کو پلیٹ فارم پر دیکھ کر میں نے ہاتھ لہرایا۔ سب سے پہلے ظفر میاں ہی میرے ڈبے کی طرف جھپٹے اور میرے پلیٹ فارم پر اترتے ہی اس گرمجوشی اور ساتھ ہی ساتھ نیاز مندی سے ملے ہیں کہ حیرت ہو رہی تھی کہ یہ وہی سرکش اور سرپھرا ظفر ہے جس سے ہر شریف آدمی کو اپنی عزت آبرو کی وجہ سے ڈر لگتا تھا۔ ظفر صاحب کا معانقہ ختم ہی ہوا تھا کہ ملک صاحب قبلہ سراپا شفقت بنے ہوئے اپنے کانپتے ہاتھوں کو آگے بڑھائے میرے قریب آئے اور گلے سے لگا کہ میری پیشانی چوم لی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے اگر نہ آتے تو میں اپنے جذب کو خام اور اپنی طلب کو ...'' اور یکا یک غفور کی طرف دیکھ کر اپنا جملہ پورا کئے بغیر بولے۔ ''لو اپنے سب سے بڑے عاشق زار میاں غفور سے تو ملو''

میں نے بڑھ کر غفور کو گلے لگا لیا۔ اس عرصہ میں ظفر صاحب سامان اتروا چکے تھے ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے باہر آئے اور ملک صاحب کے موٹر پر گھر روانہ ہو گئے۔

آج ملک صاحب نے اپنی کوٹھی کو اس طرح سجایا تھا جیسے برات آنے والی ہو۔ حد یہ

ہے کہ کوٹھی سے متعلقہ سڑکوں پر نئی اور تازہ سرخی بکھری ہوئی نظر آئی اور تو اور سڑک پر کاغذ کی نیلی پیلی اور اودی جھنڈیاں بھی لگائی گئی تھیں اور تینوں کا ایک پھاٹک بنا کر اس پر لکھا گیا تھا۔ ''خوش آمدید۔'' ملک صاحب نے اس طرف مجھ کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔'' یہ سب کچھ غفور میاں نے کیا ہے۔ کل تک یہ حضرت اپنی عمر کے مطابق بوڑھے تھے مگر تمہارا تار ملتے ہی بچوں سے بھی زیادہ بچپن ان میں پیدا ہو گیا۔ ساری رات جھنڈیاں بنائی گئی ہیں اور سارا دن کوٹھی کو سجانے میں صرف کیا ہے۔ موٹر سے اتر کر میں نے پھر واقعی ایک بے ساختہ جذبے کے ماتحت غفور کا ہاتھ پکڑ کر اس کو سینے سے لگا لیا اور اپنی اوقات کے مطابق باہر ہی ٹھہرنے کے ارادے سے ظفر صاحب سے پوچھا۔'' کیوں بھیا میرے لئے کون سا کمرہ ہے۔''

ظفر نے نہایت سلیقہ سے جواب دیا۔'' سارا گھر آپ ہی کے لئے ہے۔''

ملک صاحب نے خوش ہو کر کہا۔'' سن لیا ظفر میاں کا جواب اور محسوس کیا کچھ ان میں فرق میں تو اس کو بھی شفقت میاں تمہارا تصرف سمجھتا ہوں کہ ظفر میں خدا نظر بد سے بچائے وہ انقلاب پیدا ہوا ہے کہ میں تو حیران ہوں خدا اس کی عمر میں برکت دے۔ مجھے اب اس سے کوئی شکایت نہیں ہے اور میں اس سے بے حد خوش ہوں۔''

ملک صاحب کی زبان سے ظفر کے متعلق یہ باتیں سن کر جو مسرت مجھ کو ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے اس لئے کہ ظفر کی تربیت اور اصلاح میں بنیادی ہاتھ تو میرا ہی تھا مگر میں ملک صاحب کی رائے کے بعد دراصل غفور میاں کی رائے معلوم کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچ سکتا تھا اس لئے فی الحال رسمی طور پر خوش ہو کر میں نے کہا۔'' ظفر میاں کے متعلق میں تو ایک دن کے لئے بھی مایوس نہیں ہوا تھا اور مجھے امید تھی کہ آپ ہی ایک دن ان کی تعریف کریں گے۔'' یہ کہہ کر ظفر کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے میں نے اس کو محبت سے اپنی طرف کھینچ لیا۔

ملک صاحب نے گویا چونک کر کہا۔

”ارے بھئی تو اندر کیوں نہیں چلتے۔ یعنی آپ کا مطلب یہ ہے کہ اب بھی باہر ہی ٹھہریں گے۔ تمہارے آنے کی اطلاع تو کل ہوئی ہے مگر یہ مسئلہ یہاں پہلے ہی طے ہو چکا ہے کہ اب نہ تو تمہاری چچی تم سے پردہ کرنے پر راضی ہیں نہ تمہاری بہن غزالہ بلکہ ان دونوں کو تو غصہ آ رہا ہوگا کہ میں تم کو باہر ہی کیوں روکے ہوئے ہوں۔ آؤ اندر چلیں۔“ یہ کہہ کر ملک صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اندر جانے کے دروازے پر پہنچ کر آواز دی۔

”ارے بھئی ہم لوگ آ رہے ہیں۔“

ظفر میاں دانستہ باہر ہی رہ گئے اور ملک صاحب مجھ کو لئے ہوئے گھر کے اندر داخل ہو گئے جہاں برآمدے ہی میں چچی جان آنکھوں سے شفقت برساتی ہوئی ملیں اور ان کی آڑ میں غزالہ بھی سمٹی سمٹائی کھڑی تھی۔ میں نے جھک کر چچی جان کو سلام کیا تو وہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر اگلے زمانے کی بڑی بوڑھیوں کی طرح پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔ ”جیتے رہو ہزاری عمر پاؤ۔“

ملک صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ ”اور وہ کہاں ہیں اپنے بھیا کی چہیتی بہن۔“

بیگم صاحبہ نے غزالہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”لو اور سنو یا تو ناک میں دم کر رکھا تھا کہ ایک تو مجھے اسٹیشن نہیں لے گئے ابا جی دوسرے اب بھیا کو لائے ہیں تو باہر ہی روکے ہوئے ہیں، یا اب سمٹی ہوئی کھڑی ہے۔ پگلی کہیں کی۔ بھائیوں سے بھی کوئی شرم کرتا ہے۔“

میں نے غزالہ کو خود مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”خیریت ہی ہوگی کہ تم خود سامنے آ گئیں ورنہ میں تو طے کر چکا تھا کہ اس معاملہ میں زبردستی کرنا پڑے گی……“

ملک صاحب نے پھر کوئی بھولی ہوئی بات یاد کر کے کہا۔ ”ارے بھئی ہاں۔ وہ میں نے کہا بلقیس کا بھی خط آ گیا ہے۔ وہ پا بہ رکاب بیٹھی ہے۔ غزالہ بیٹی اپنی بھابھی کا خط تو دکھاؤ ان کو، صاحب میں تو رو دیا اس خط کو دیکھ کر کہ بیچاری کتنے دنوں سے چھوٹی ہوئی ہے

شوہر سے اور اس کے تو گویا میرے اور غزالہ کے خط سے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے سوکھے دھانوں پانی پڑ جائے ارے بھئی وہ خط دکھانا ان کو۔"

میں نے کہا۔"جی ہاں مجھے معلوم ہے جو کچھ لکھا ہوگا انہوں نے میرے پاس بھی خط بھیجا ہے جس میں وہ لکھ چکی ہیں کہ آپ نے اور غزالہ نے ان کو خرید لیا ہے۔"

بیگم صاحبہ نے ملک صاحب کی خبر لی۔"اے میں کہتی ہوں کہ کیا اس کو لئے بس اسی طرح کھڑے رہو گے ایک تو وہ اتنے بڑے سفر سے تھکا ہارا آ رہا ہے۔ دوسرے تم باتوں میں لگائے ہوئے ہو بیٹا تم نہادھو کر آدمیوں کی صورت بنو تو میں کھانا لگواؤں، باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ میں نے کہا اس کا سامان بھی کمرے میں رکھوا دیا ہے۔"

ملک صاحب نے کہا۔"اس کی فکر نہ کرو ظفر اب ماشاءاللہ بڑا ذمہ دار آدمی بن چکا ہے اس نے سب ٹھیک کر دیا ہوگا۔ بے انتہا خوش ہے ان کے آنے سے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا۔"خوش نہ ہوگا جانتا ہے کہ ان کی بدولت وہ آدمیوں کے جامے میں آیا ہے۔"

ملک صاحب نے اصلاح فرمائی۔"یعنی آدمیت کے جامے میں۔ بہرحال آؤ بھئی مولانا تم کو ظفر میاں اور غفور کے حوالے کروں پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

چلتے چلتے بیگم صاحبہ نے مامتا بھری ماں کی طرح کہا۔"اتنے ہی دنوں میں سوکھ کر رہ گئے ہو۔ ایک تو کراچی کا پانی پھر ہوٹل کا دانہ۔"

ملک صاحب نے دانہ اور پانی کا ترجمہ کیا۔"آب ودانہ...... بہرحال آؤ میاں۔"

ملک صاحب نے باہر آ کر دیکھا تو واقعی ظفر میاں نے تمام سامان ٹھیک سے لگا دیا تھا اور غفور میاں پاجامے میں ازار بند ڈال رہے تھے۔

☆☆☆

صبح آنکھ ہی اس طرح کھلی کہ غفور میاں بستر کی چائے لگا رہے تھے۔ مدت کے بعد یہ بستر کی چائے ملی تھی۔ ابھی میں اس بستر کی چائے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ ظفر میاں نے نہایت شریفانہ انداز سے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ''السلام علیکم''

میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے بجائے کرسی کے بستر پر ہی ظفر میاں کو بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بھئی اب بتاؤ کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔''

بجائے ظفر کے غفور میاں نے جواب دیا۔ ''ظفر میاں کھو گئے تھے آپ رحمت کا فرشتہ بن کر آئے اور ان کو ڈھونڈ دیا۔ یہ ہیں رنگ ڈھنگ۔''

میں نے مسکرا کر ظفر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مطلب یہ کہ ٹھیک ہے نا سب کچھ۔ اطمینان ہے نا۔''

ظفر نے کہا۔ ''سب کچھ آپ ہی کے بدولت ہوا ہے۔ غفور میاں نے بالکل ٹھیک کہا میں خود اپنے لئے گم ہو گیا تھا اور اب خود اپنے کو پا گیا ہوں......''

غفور نے کہا۔ ''آپ جو کتاب چھوڑ گئے تھے اس نے تو کایا ہی پلٹ دی۔ جادو کر دیا ہو جیسے اس کتاب نے۔ ظفر میاں تو آپ کو اتنا یاد کرتے تھے کہ میں کیا کہوں۔ روزانہ بس یہی ذکر رہتا تھا کہ شفقت بھائی میری زندگی سنوار گئے......''

میں نہ جانے کیا کہنے والا تھا کہ ملک صاحب قبلہ کے تشریف لے آنے سے بات ختم ہو گئی۔ ملک صاحب نے آتے ہی کہا۔ ''ذرا غفور میاں سے پوچھ لیجئے کہ میں کس وقت

بیدار ہوتا ہوں اور ملاحظہ فرمائیے کہ آج کس وقت سو کر اٹھا ہوں۔ بہرحال اب جناب تیار ہو کر اندر تشریف لے چلیں چائے اندر ہی ہوگی اور پھر گپ لڑے گی۔ میاں بہت سی باتیں کرنا ہیں اتنے دنوں کے بعد ملے ہو تمہاری چچی اور غزالہ بھی انتظار کر رہی ہیں۔"

میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "بس پندرہ منٹ میں تیار ہوا آپ تشریف رکھئے جب تک۔"

ملک صاحب نے غفور کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "بھئی غفور آج لاؤ ویسے ہی سیاہ تیتر جیسے اس دن لائے تھے۔"

ملک صاحب کو غفور اور ظفر کے سپرد کر کے میں تو ضروریات سے فارغ ہونے چلا گیا اور معلوم نہیں ملک صاحب قبلہ نے کب غفور اور ظفر کو غائب کر دیا۔ بہرحال جب میں باہر نکلا ہوں تو ملک صاحب اخبار پڑھ رہے تھے مجھ کو دیکھتے ہی سر سے پیر تک دیکھنے کے بعد بولے۔ "صاحب تیار ہو گیا۔ اچھا تو گویا یہ نیا سوٹ ہے۔ ماشاءاللہ خوب ہے۔ بہرحال آؤ اندر چلیں۔"

اندر بیگم صاحبہ اور غزالہ چائے کی میز پر منتظر تھیں۔ غزالہ اس وقت سمٹی سمٹائی ہوئی نہ تھی بلکہ اس طرح بیٹھی تھی جیسے واقعی بہنیں بھائیوں کے سامنے بے تکلف بیٹھتی ہیں۔ ایک اچھی تندرستی کی خوب صورت لڑکی جس کی جامہ زیبی اور سلیقہ دونوں لباس سے ظاہر تھا اور عصمت وعفت کی پوری تابانی نگاہوں میں موجود تھی اس وقت میرے سامنے میرے دل میں سب سے پہلا یہ خیال آیا کہ خدا کرے ظفر اپنے کو اس لڑکی کے شایان شان بنا سکے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے چائے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی ظفر کو دیکھ کر ہوئی ہے۔

پوری بات بھی نہ کہنے دی اور غزالہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "لیجئے میں تو خوش ہو رہی تھی

کہ شاید میرے بھیا سب سے زیادہ خوش ہوئے ہوں گے مجھے دیکھ کر۔"

میں نے کہا۔"تم کو تو بغیر دیکھے بھی میں بہت زیادہ خوش تھا کہ خدا نے مجھ کو پلی پلائی ایسی اچھی بہن دے دی ہے۔ تم کو دیکھ کر میری معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا ہے میں نے جو بلند رائے تمہارے متعلق قائم کر رکھی تھی تم کو ہو بہو اس کے عین مطابق پایا البتہ اس بات کی خوشی ضرور ہے کہ اب بہن اور بھائی ایک ساتھ ایک میز پر بھی نظر آ رہے ہیں۔"

بیگم صاحبہ نے کہا۔"بھیا کی تو وہ للک ہے، بہن کو کہ میں کیا کہوں اتنے ہی دنوں میں نہ جانے کتنے سوئیٹر بن چکی ہے تمہارے لئے، اس روز ہم لوگ کپڑا خریدنے گئے تو سوٹ کا ایک کپڑا دیکھ کر میرے سر ہوگئی کہ یہ تو بھیا کے لئے لے لو۔"

میں نے کہا۔"اس کا مجھ کو اندازہ ہے اور میں اپنی بہن کے لئے تڑپ اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ اس کے بعد مجھ کو یہ باتیں سن کر ذرا بھی تعجب نہیں ہو رہا ہے۔ تو میرے لئے سوئیٹر بنائے گئے ہیں۔ اچھی بات ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میں نے جو چیزیں کراچی کے بازار چھان کر اپنی بہن کے لئے جمع کی ہیں وہ بازی لے جاتی ہیں یا میری بہن کے تحفے۔"

غزالہ نے کہا۔"جی ہاں تو کیا میں نے مقابلہ کرنے کے لئے سوئیٹر بنائے ہیں۔"

میں نے باہر سے سوٹ کیس یہیں منگا کر غزالہ کی گھڑی، ٹاپس، نیکلس اور کپڑے نکال کر اس کو دیتے ہوئے کہا۔"یہ تو بھیا لایا ہے بہن کے لئے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا۔"یہ زیادتی ہے، میں نے کہا دیکھ رہے ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔"

میں نے گرم کوٹ کا کپڑا نکال کر بیگم صاحبہ کو دیتے ہوئے کہا۔"اور یہ لائے ہیں شفقت میاں اپنی چچی جان کے لئے۔"

ملک صاحب نے کہا۔"بھئی لاجواب ہے یہ کپڑا، کیا کہنا ہے کیا رنگ ہے اور کیا

شان ہے۔ مگر صاحب یہ ہے واقعی زیادتی۔"

میں نے ایک بنڈل نکال کر کہا۔ "اور یہ ہے ایرانی فرفل آپ کے لئے۔"

ملک صاحب نے واقعی خوش ہو کر کہا۔ "یہ ہے البتہ ایک چیز نہ میں نے کہا۔ دیکھا میرا فرفل بخدا اسد اللہ خان غالب نظر آؤں گا اس فرفل میں۔"

ایک گرم کوٹ کا کپڑا غفور کو دیتے ہوئے میں نے کہا۔ "غفور میاں یہ آپ کے اوور کوٹ کا کپڑا ہے اور اس کی سلائی میرے ذمے ہو گی۔ سب سے عجیب تحفہ ہے ظفر میاں کے لئے ذرا ان کو بلوا دیجئے۔"

یہ سنتے ہی غزالہ تو چوکڑی بھرتی ہوئی یہ جا اور وہ جا اور ملک صاحب بے بدستور تکلف فرماتے ہوئے کہا۔ "گویا صاحبزادے کافی زیربار ہوئے ہیں۔ مجھے یہ بات قطعاً پسند نہیں آئی۔"

بیگم صاحبہ نے کہا۔ "اور تو سب خیر مگر غزالہ کے لئے زیور جو لائے ہیں یہ البتہ زیادتی ہے۔"

اس عرصے میں غفور میاں ظفر کو لے آئے تھے۔ میں نے ایک لفافہ نکال کر ان کو دیتے ہوئے کہا۔ "ظفر تم میرے چھوٹے بھائی ہو اور میں تمہارے لئے جو تحفہ لایا ہوں مجھے امید ہے کہ تم اسے قبول کر کے مجھ کو سرخرو کرو گے۔"

ملک صاحب نے ظفر کے ہاتھ سے لفافہ لے کر کاغذ نکال کر پڑھا۔ یہ کاغذ ہوٹل کے لین دین کا تھا شروع سے آخر تک اس کو پڑھ کر حیرت سے مجھ کو دیکھ کر بولے۔ "میں سمجھا نہیں یہ کیا ہے۔"

اور میں نے نہایت تفصیل سے ہوٹل کی ساری داستان اور ظفر کے لئے ہوٹل خریدنے اور اس خیال سے خریدنے کا حال سنا دیا کہ اسی ہوٹل کو نہایت باقاعدگی اور معیاری انداز

سے چلا کر یہ ثابت کرنے کا ارادہ ہے کہ وہ ہوٹل جس کو آپ شرافت کے لئے خطرناک سمجھتے ہیں اگر شرافت سے چلایا جائے تو کیسا اچھا کاروبار بن سکتا ہے۔ تمام تفصیل سننے کے بعد ملک صاحب نے کہا۔

’’بھئی یہ تو سب ٹھیک ہے اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ میں بھی سمجھ رہا ہوں اس کاروبار کو بھی اگر تمہارا ہاتھ شامل ہے تو میں مناسب سمجھتا ہوں اور یہ بھی طے ہو جائے گا کہ ظفر اس کو میری کن شرائط کے ماتحت سنبھالیں گے مگر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ گویا رہنا پڑا کراچی میں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’کراچی سے بہتر اس کاروبار کا میدان اور کہیں نہیں ہے۔ میں آپ کو اس سلسلہ کی تمام تفصیل پھر سمجھا دوں گا فی الحال تو ظفر صاحب میری طرف سے یہ ہدیہ قبول کریں۔‘‘

ملک صاحب نے کہا۔ ’’خیر آپ تو ہیں پاگل۔ یہ کاغذ مجھ کو دیجئے میں اس ہدیہ کو قبول کرتا ہوں اب آپ میرے ساتھ پرمٹ آفس چلیں سب سے مقدم یہی کام ہے۔‘‘ اور ہم لوگ پرمٹ آفس روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

ملک صاحب قبلہ تو سب کچھ طے ہی کر چکے تھے چنانچہ پرمٹ کے حصول میں کوئی خاص دقت نہ ہوئی اور دوسرے ہی دن میں روانہ ہو گیا دلی کے ہوائی اڈے پر بیگم صاحبہ معہ فردوس کے موجود تھیں فردوس تو واقعی نہایت معتبر قسم کے بزرگ نکل آئے تھے جب ان کی والدہ نے تعارف کرایا کہ ''ڈیڈی ہیں یہ تمہارے'' تو نہایت غور سے اس خاکسار کو سر سے پیر تک دیکھ کر اپنی ماں سے تصدیق کی ''ڈیڈی؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں ہاں ڈیڈی جس کو تم ہیڈی کہتے تھے'' اور میں نے اس کو گود میں لے کر پیار کیا تو وہ مجھ سے زیادہ ہوائی جہاز میں دلچسپی لیتے ہوئے بولے۔ ''جاج۔ ڈیڈی کا جاج۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں، یہ ڈیڈی کا جاج ہے اب اسی پر فردوس جائے گا۔ ڈیڈی کے ساتھ۔''

وہ حضرت اب دوست جوتے جا رہے تھے نہایت متانت سے کہا۔ ''جائے گا جاج۔ پر۔''

اور بیگم صاحبہ اس طرح کھلی جا رہی تھیں جیسے ہمارے شعراء کرام اپنی پھلتی پھولتی غزل پر خوش ہو کر سلام کرتے ہیں بس سلام تو نہیں کر رہی تھیں مگر چہرے پر انداز وہی مشاعرے والا تھا جب میں فردوس کو گود میں لے کر چلنے لگا تو نہایت فخر سے بولیں۔ ''اس کو اتار دیجئے نا خوب چل لیتا ہے اب تو جوان مردوئے کو گود میں کیوں لادے ہوئے ہیں۔''

میں نے ماں کو خوش ہونے کا موقع دیتے ہوئے فردوس کو گود سے اتار دیا اور وہ انگلی پکڑ کر نہایت ٹھاٹھ سے چلنے لگا تو بیگم صاحبہ نے اسی کے کمالات اور معجزات بیان کرنا شروع کر دیئے۔ ''دو دن سے یہی رٹ لگی ہوئی ہے کہ ڈیڈی جاج پر آئیں گے جو ہوائی جہاز اڑتا ہوا دیکھا اور دوڑا صحن میں ڈیڈی کا جاج۔ دس تک کی گنتی یاد کر لی ہے ذرا سنیئے تو اس سے آٹھ

کو آ چھ کہتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہیں اس کی زبان ایسی ہی نہ رہ جائے......"

ایک سلسلہ تھا فردوس کے متعلق باتوں کا جو کسی طرح ختم ہی نہ ہوتا تھا تمام راستے یہی باتیں رہیں آخر میں نے ستانے کے لئے کہا۔

"دیکھو بلقیس فردوس کے پیدا ہونے سے پہلے تم زیادہ تر خود میرے متعلق باتیں کیا کرتی تھیں۔ وہ ایک دن کے سفر سے بھی جب میں واپس آتا تھا تو تم میرے ہی بارے میں گھوم پھر کر بے بات کی بات نکال لیا کرتی تھیں اب سوائے فردوس کے کوئی اور ذکر ہی نہیں ہے۔"

بلقیس نے بڑی عمدہ بات کہی۔ "تو گویا آپ جل رہے ہیں۔ ابا جان کے پاس ایک گھوڑا تھا نہایت قیمتی نہایت عمدہ۔ بس عیب اس میں یہ تھا کہ جہاں اپنی پرچھائیں دیکھی اور بھڑکا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "تو گویا یہ میں اپنی پرچھائیں دیکھ کر بھڑک رہا ہوں مگر واقعی تم نے تو اس کو بہت بڑا کر دیا۔ چہرے پر انتہائی سفیدگی اور آنکھوں میں بے حد شرارت، معلوم نہیں ان دونوں میں سے کون سی چیز سچی ہے۔"

بلقیس نے کہا۔ "شریر تو خیر ہے ہی کیا مجال جو کوئی اس کو کوئی چکمہ دے جائے۔ ابھی تین چار دن ہوئے رات کو نوکر نے اسے ڈرایا کہ سو جاؤ نہیں تو جو جو آ جائے گا۔ میں نے اس کو بہت ڈانٹا کہ خبردار جو آئندہ اس کو ڈرایا۔ وہ چپ ہو گیا تو آپ کہتے ہیں اس سے کہ تم "دوس" "امی" "جو جو" یعنی تم فردوس ہو اور تمہارے لئے امی جو جو ہیں۔"

اور یہ کہہ کر فردوس کو فرط محبت سے چوم لیا وہ حضرت اس وقت ہوائی جہاز اور موٹر کا موازنہ کر رہے تھے کہنے لگے۔ "امی پوں پوں چھی جاج! ہاہاہا" یعنی موٹر واہیات چیز ہے جہاز کا کیا کہنا سبحان اللہ۔

ہوائی اڈے سے گھر تک یہی تماشے ہوتے رہے اور گھر پہنچ کر تو عزیزوں اور دوستوں کا وہ سیلاب آیا کہ ایک ہفتہ کا قیام اسی چھینا جھپٹی میں ختم ہو گیا کہ آج اس عزیز کے

یہاں صبح کا ناشتہ ہے کل اس عزیز کے یہاں دو پہر کا کھانا ہے اس دوست کے یہاں سہ پہر کی چائے اس دوست کے یہاں رات کا کھانا ہے۔ سسرال والے بے چارے ترس کر رہ گئے کہ کبھی تو گھر میں بھی دو گھڑی بیٹھتے۔ ایک تو اتنے دنوں کے بعد آئے اور وہ بھی اس لئے آئے کہ اب اس ملک سے جو تعلق تھا وہ بھی ہمیشہ کے لئے منقطع کر دیں لہٰذا دعوتوں اور پارٹیوں کی عجیب ریل پیل تھی۔ ہفتہ بھر پیروں میں سنیچر بندھا رہا یہاں تک کہ روانگی کا دن آ گیا بلقیس اپنے عزیزوں سے بچھڑنے کے وقت خوب خوب روئیں اور گنگا جمنا کے اس ملک میں آنکھوں سے گنگا جمنا بہانے کا محاورہ واقعی کر دکھایا مگر روانگی کے وقت دو مسافر بہت خوش تھے ایک فردوس جس کو ہوائی جہاز پر بیٹھنے کا شوق تھا دوسرا میں خود جس کو یہاں کا ایک ایک منٹ کھل رہا تھا۔ ایک آزاد ملک کی آزاد فضاؤں میں آزادی اور اطمینان کی سانس لینے والا جب ایسے دیس میں پہنچ جائے جہاں اپنے ساتھ وہ سلوک ہو جو اچھوتوں کے ساتھ ہوتا ہے تو طبیعت کا مکدر رہنا قدرتی سی بات ہے۔ مجھ سے تو اپنے اس سابق وطن کے افراد کی وہ نگاہیں بھی برداشت نہ ہوتی تھیں جو میری طرف اٹھا کرتی تھیں معلوم ہوتا تھا جیسے میں کوئی نئے قسم کا جانور ہوں جو ان لوگوں نے پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ ان لوگوں سے کہوں کہ میں تم ہی میں سے ایک ہوں ذرا مغائرت اور تعصب کی عینک اتار کر دیکھو تو مجھ کو بیگانہ نہیں یگانہ پاؤ گے اپنی روایات اور اپنی معاشرت کے پنپنے کے لئے ایک علیحدہ خطہ طلب کر لینا اور حاصل کر لینا اتنا بڑا جرم تو نہیں کہ تم مجھ کو پہچان بھی نہ سکو۔ البتہ میں خود اگر یہ کہوں تو حق بجانب ہوں گا کہ میں نے اپنے اس سابق وطن میں دنیا ہی بدلی ہوئی دیکھی ہر بات مختلف ہر چیز مختلف زبان ایسی بولتے ہیں جو شاید مہا بھارت اور رامائن کے دور میں بھی نہ بولی جاتی ہوگی۔ چھوت چھات کچھ جنون کی حد تک بڑھ گیا ہے، نفاست اور سلیقہ ہر جگہ سے رخصت ہو چکا ہے۔ مختصر یہ کہ میرا تو ایک ہی ہفتے میں برا حال ہو گیا اور اپنا

پاکستان واقعی اپنی جنت محسوس ہونے لگا۔

دہلی سے لاہور تک ہوائی جہاز کا سفر ہی کیا ہے بس ایک اڑان۔ مگر اتنی ہی دیر میں محترمہ بیگم صاحبہ کا مارے ابکائیوں کے برا حال ہو گیا۔ رہ رہ کر وہ میرا شانہ دبوچ لیتی تھیں کہ "ہائے گرا ہوائی جہاز" مگر فردوس صاحب بڑے خوش تھے البتہ ذرا اس بات سے ناراض رہے کہ ہوائی جہاز کی کھڑکیوں میں شیشے کیوں لگے ہوئے ہیں اور ان کو گردن نکال کر جھانکنے کا موقع کیوں نہیں ملتا ان کے لئے یہ سفر اس قدر مختصر ثابت ہوا کہ جب والٹن کے ہوائی اڈے پر جہاز اترا ہے اور ہم لوگ جہاز سے برآمد ہوئے ہیں تو دونوں ہاتھوں کو عجیب طرح گھما کر مجھ سے دریافت کیا۔ "بچھ" یعنی بس ختم ہو گیا سفر۔

ہوائی اڈے پر صرف ملک صاحب اور ظفر ہی نہیں بلکہ غفور کے ساتھ دو برقعہ پوش خواتین بھی تھیں جن میں سے ایک نے لپک کر میری گود سے فردوس کو چھین لیا وہ تو کہیئے فردوس اس قسم کے بچوں میں نہیں ہے کہ دوسروں کے پاس جانے سے ہچکچائے ورنہ سیاہ برقعہ دیکھ کر تو خود مجھے وحشت ہوتی ہے وہ تو پھر بھی بچہ ہے۔ غزالہ تو فردوس کو لے اڑیں چچی جان نے بلقیس کو گلے سے لگا لیا اور ہم لوگ ہوائی اڈے سے اپنا سامان لیتے ہوئے اور سامان کی جانچ پڑتال کراتے ہوئے باہر آ گئے۔ ملک صاحب نے ایک موٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی ہمشیرہ صاحبہ اس موٹر کو ہاروں اور پھولوں کی چادروں سے سجانے والی تھیں۔ میں نے کہا کہ کیوں بیچارے کا مذاق اڑواؤ گی لوگ سمجھیں گے مخالف سمت سے کوئی حاجی آ رہا ہے بہر حال بیٹھو، گھر کی گاڑی میں خواتین بیٹھ جائیں اور ٹیکسی میں ہم لوگ۔"

ہم لوگ اسی انتظام سے بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

کچھ پوچھئے نہیں بلقیس ان لوگوں سے مل کر کس قدر خوش تھیں دو چار ہی دن میں یہ حال ہو گیا گویا واقعی اس گھر کی نہایت چہیتی بہو ہیں اور تو اور فردوس صاحب سے ملک صاحب کے مراسم کچھ اس قسم کے ہو گئے تھے کہ بغیر دادا میاں کے ان کو چین ہی نہ تھا چنانچہ اس وقت بھی جب میں کمرے میں داخل ہوا تو دیکھتا کیا ہوں کہ بڑے میاں گھوڑا بنے ہوئے ہیں اور فردوس صاحب ان کی پیٹھ پر بیٹھے سارے فرش پر ان کو گھٹنے اور ہاتھوں کے بل چلاتے پھر رہے ہیں، میں نے یہ منظر دیکھ کر کہا۔ ''کیوں بھئی فردوس میاں دادا میاں کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے۔''

فردوس نے کہا۔ ''ڈیڈی جائیں دادا گھوڑا۔'' یعنی ڈیڈی تشریف لے جائیں دادا میاں گھوڑا بنے ہوئے ہیں۔''

بلقیس نے کہا۔ ''رات کا قصہ آپ نے نہیں سنا کوئی دو بجے ہوں گے کہ آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور حکم دیا کہ فوفو کے پاس چلو۔'

میں نے کہا۔ ''فوفو سے کیا مطلب؟''

بلقیس نے بتایا کہ غزالہ کو پھپھو کہلوانے کی کوشش کی گئی تھی جس کو وہ فوفو کہنے لگے

اب غزالہ اور ملک صاحب سے ان کے بے حد مراسم تھے بلکہ ملک صاحب کو تو اتنے ہی دنوں میں یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ لڑکا میرے اور غزالہ کے پاس نہایت آرام اور اطمینان سے رہ سکتا ہے اور کیوں نہ رہتا غزالہ نے دو چار ہی دن میں سارا گھر کھلونوں سے بھر دیا تھا کچھ کھلونے تو پہلے ہی سے منگا کر رکھ چھوڑے تھے اور باقی فردوس کو دیکھ کر اور اس سے دوستی پیدا کر کے منگائے اور اب اچھی خاصی کھلونوں کی دکان تھی جس کے مالک فردوس صاحب تھے۔ پھر یہ کہ ہر وقت موٹر کی سیر اور گودیوں کی سواری گھر میں رہے تو چچی جان اور غزالہ خدمت کے لئے موجود اور باہر گئے تو ظفر اور غفور پھر سب سے بڑے خدمت گزار ملک صاحب جو ٹھہرے۔

دہلی سے ان لوگوں ں کے آنے کے بعد کچھ دن تک کوئی فیصلہ کن اور ٹھوس بات ہی نہ ہو سکی مگر آخر کب تک نہ ہوتی ایک دن میں نے بلقیس سے کہا کہ چچی جان اور ملک صاحب کو پکڑ لاؤ میں ظفر کو بلائے لیتا ہوں ذرا پروگرام تو بن جائے اور کوئی بات تو طے ہو میری چھٹی ختم ہونے والی ہے آخر مجھے بھی تو کوئی فیصلہ کرنا ہے چنانچہ جب اس کانفرنس میں حاضری پوری ہو گئی تو میں نے یہ سوال اٹھایا کہ اب چھٹی ختم ہو رہی ہے فی الحال میں یہ چاہتا ہوں کہ صرف ظفر میاں کو لے کر کراچی جاؤں اور ہوٹل کا نظم و نسق ان کے حوالے کر کے اپنی اسکیم کو بروئے کار لاؤں۔

ملک صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ ”ٹھہریئے جناب میں تمام معاملات قطعی طور پر طے کر چکا ہوں اور آپ سب کا باقاعدہ پروگرام میں نے بنا لیا ہے۔ مجھ کو صرف بہو بیگم کے آنے کا انتظار تھا اور اب میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنا فیصلہ آپ لوگوں کو سنا دوں۔ ہوٹل کے سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا نام ہو گا فردوس ہوٹل اور ہوٹل کی ملکیت بھی اسی بچے کے نام تبدیل ہو گی۔“

میں نے کچھ کہنا چاہا تو ملک صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر کہا۔ ''پہلے پوری بات سن لیجئے بندہ نواز ظفر بیشک آپ کے ساتھ جائیں گے اور ہوٹل کا نظم ونسق بھی سنبھال لیں گے بلکہ ہم سب چلیں گے آپ کے ساتھ اور وہاں جانے کا مقصد یہ ہوگا کہ بجائے اس کے کہ میں یہاں ایک اور کوٹھی بنواؤں کیوں نہ کراچی میں بنوائی جائے۔ جگہ وغیرہ دیکھ کر غزالہ کے لئے ایک مکان وہاں بھی کیوں نہ بنوادیا جائے۔ خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں فی الحال تو ظفر میاں آپ ذرا باہر تشریف لے جائیں مجھے ان سے کچھ مشورہ کرنا ہے جس میں آپ کی موجودگی غلط ہے۔'' ظفر کے جانے کے بعد ملک صاحب نے کہا۔ ''بھئی سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنے جانے سے پہلے اپنی بہن کی شادی کرتے جاؤ میرے پاس تمام سامان مکمل ہے شادی کے سلسلہ میں مجھ کو کوئی دھوم دھڑکا بھی نہیں کرنا ہے بس نکاح نہایت سادگی کے ساتھ اور پھر رخصتی گھر کی گھر ہی میں، میں چاہتا ہوں کہ یہ رکی طور پر غزالہ کی طرف سے تم اور بلقیس انتظام کرو اور ظفر کی طرف سے میں اور تمہاری چچی انتظام کرتے ہیں اور کل پرسوں جس دن چاہو یہ فرض بھی پورا کردو۔''

بلقیس نے کہا۔ ''اتنی جلدی؟ آخر کسی نہ کسی کو تو بلانا ہی ہوگا۔''

چچی جان نے کہا۔ ''مجھے جس کو بلانا تھا وہ آگئی ہے ایک آدھ عزیز اور ہیں وہ جس وقت بلائے جائیں آسکتے ہیں۔ ظفر کی بھی یہی خواہش ہے کہ خواہ مخواہ کی باتوں میں روپیہ برباد نہ کیا جائے جہیز کی ایک ایک چیز یہاں تک کہ لڑکے کے کپڑے، بَری کے جوڑے سب کچھ تیار ہے اگر آج طے کرتو میں آج کرسکتی ہوں شادی۔''

میں نے کہا۔ ''بس تو ٹھیک ہے اللہ کا نام لے کر دیجئے کل ہی نکاح۔''

ملک صاحب نے کہا۔ ''اور نکاح کے بعد دولہا دلہن کو لے کر ہم لوگ کراچی چلیں گے۔ مجھے اب ظفر کی طرف سے پورا اطمینان ہے اور اب وہ واقعی گر کر سنبھلا ہے تو انشاء اللہ

سنبھلا ہی رہے گا، تم کو حیرت نہیں ہوئی کہ کس قدر معقولیت آ گئی ہے اس میں۔"

چچی جان نے کہا۔ "یہ سب کچھ ان ہی کی تعلیم کا تو نتیجہ ہے تو پھر پرسوں کرو نا جمعہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "چلئے پرسوں سہی۔"

بلقیس کو ذرا تذبذب تھا مگر جب میں نے ان کو سمجھا دیا کہ میں آج اور کل کے اندر ہی تمام سامان درست کردوں گا اور ہم لوگوں کو اپنی طرف سے جو کچھ دینا ہے وہ چیک کی صورت میں دے دیں گے تو وہ بھی راضی ہو گئیں اور یکایک اس گھر کی فضائیں ایک ہنگامے کی صورت میں تبدیل ہو گئیں۔ عجیب ترقی پسند خاندان نکلا یہ بھی بھلا جس کی ایک لڑکی ہو اور دولت کی انتہا نہ ہو وہ اس طرح شادی کرے؟ مگر یہاں تو چٹ منگنی پٹ بیاہ کی مثل صادق آ رہی تھی۔ دو دن تک سب کے سب انتظامات میں اس طرح مصروف رہے کہ تن بدن کا ہوش نہ تھا اور جمعہ کے دن نہایت فیشن ایبل قسم کی ایک مختصر سی محفل سج گئی اور نکاح ہو گیا نکاح کا وکیل مجھ ہی کو بنا پڑا۔ نکاح کے بعد کل ملا کر پچاس آدمیوں کا کھانا مردانے میں ہوا اور شاید اتنی ہی عورتیں ہوں گی اندر شالا بنے میاں فردوس جو کبھی ظفر کی گود میں آ دھمکتے تھے کبھی فوفو کہتے ہوئے دلہن کی گھونگھٹ میں جا پہنچتے تھے۔

نکاح اور رخصتی سب کچھ اسی دن ہو گیا اور دوسرے دن مجھ سے ملک صاحب نے الطاف کو تار دلوایا کہ کسی اچھے ہوٹل میں دو سوٹ بک کر لئے جائیں اور اس تار کے بعد اب سفر کے انتظامات ہو رہے تھے۔ اس عرصے میں مجھ کو یہ نوٹس مل چکا تھا کہ اس سفر سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے تمام قافلے کے ذمہ دار خود ملک صاحب ہوں گے۔

روانگی سے ایک دن قبل ظفر میاں مجھ کو کمرے میں تنہا دیکھ کر چپکے سے آ گئے اور ایک دم میرے پیر پکڑ کر بیٹھ گئے میں حیران کہ ماجرا کیا ہے اور اب جو دیکھتا ہوں تو یہ سر پھرا نوجوان رو رہا ہے مسلسل میں حیران کہ یہ قصہ کیا ہے آخر بہت کچھ پوچھنے کے بعد یہ صرف

یہ چلا کہ صرف شکر گزاری کے آنسو ہیں مسلسل یہی فرما رہے تھے۔ ''آپ نے مجھ کو خاک سے پاک کر دیا۔ آپ نے مجھ کو خرید لیا۔''

اور میں نے ان حضرت کو ایک چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک تو سالا بنایا مجھ کو اوپر سے بیوقوف بھی بنا رہے ہو۔ البتہ اگر میری بہن کے احترام اور قدر دانی میں فرق کیا تو دونوں کانوں کے بیچ میں سر کر دوں گا۔'' غزالہ بھی میرے پاس آ گئی اور میں نے پہلی مرتبہ اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ سچ سچ اس وقت محسوس ہو رہا تھا کہ مجھ کو اللہ نے کیسی اچھی بہن دی ہے۔''

☆☆☆

Susraal

Shoukat Thanvi

WELCOME BOOK PORT
Main Urdu Bazaar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
welcomebookport
welcomebookport
welbooks@hotmail.com
welbooks.com